20 sisters of one brother

19/11/5
237/9/5

بیس بہنوں کا بھائی

بچّوں کے لیے ناول

زُبیدہ سُلطانہ بیوقوف

K A K
Near [illegible] Market,
Nazimabad-4, Karachi-18

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ، راولپنڈی ، پشاور ، ملتان ، حیدر آباد ، کراچی

زبیدہ سلطانہ

بچوں کا

پہلی بار ——— 1971
تعداد ——— 3000
قیمت ——— 1.50

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور ● باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

ٹوٹا پھوٹا گھر

دارُالبنات کی بیس بچّیوں میں فِضّہ سب سے چھوٹی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ دارُالبنات لڑکیوں کے یتیم خانے کا نام ہے جس کی دیکھ بھال مریم باجی کے سپرد ہے۔ وہ بچّیوں کو بہُت پیار سے رکھتی ہیں۔ کنول آپا اُن کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ یہ بیسوں بچّیاں بڑی خوش اور چونچال رہتی ہیں کیوں کہ ان کی اُستانیاں انھیں بہُت پیار کرتی ہیں۔

ایک دِن صُبح ہی صُبح مریم باجی اور کنول آپا بچّیوں کو نہلا دُھلا کر سکُول کے لیے تیّار

کر رہی تھیں کہ کنول آپا ریحانہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولیں "ریحانہ بڑی ہنس مکھ اور پیاری بچّی ہے۔ ہر وقت پھول کی طرح کھلی رہتی ہے۔"

"اور فضّہ سب سے زیادہ ضدّی اور ہٹیلی ہے۔ جس بات پر اڑ جائے، کر کے رہتی ہے۔" مریم باجی نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بُری عادت ہے۔ اُس کی یہ عادت دُرست کرنی چاہیے۔"

"عادت کیا، یہ اس کی فِطرت ہے اور فِطرت کبھی نہیں بدلتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اِسی ضِدّی پن سے دُنیا میں نام پیدا کرے گی۔" مریم باجی نے کہا۔

مگر کنول آپا کو اُن کی یہ بات کچھ جچی نہیں۔ بھلا ضِدّی بچّے بھی دُنیا میں نام پیدا کر سکتے ہیں؟ اُنھوں نے کہا:

"میں تو سوچتی ہوں کہ وہ اپنی اِس عادت

سے کِسی دن ہمیں بھی مُصیبت میں ڈال دے گی۔"

وہ زیادہ باتیں نہیں کرنے پائی تھیں کہ یتیم خانے کے صدر شیخ انور آ گئے۔ بچّیاں انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور دوڑ کر ان کے گِرد جمع ہو گئیں۔ مگر شیخ صاحب نے پہلے کی طرح آج انھیں پیار نہ کیا۔ نہ ہنسے نہ بولے۔

"بچّیوں کو سکُول بھیج دیجیے۔ مجھے یتیم خانے کی عِمارت کو اچھّی طرح دیکھنا ہے۔ برسات شُروع ہو گئی ہے اور پُرانی عِمارتیں دھما دھم گِر رہی ہیں۔ صُبح اخبار میں پڑھا کہ کل شہر میں چھ سات مکان گِر گئے۔ کئی آدمی دَب کر مر گئے۔ پڑھتے ہی میں دوڑا ہُوا آیا ہُوں۔ اِس مکان کی مرمّت جلدی ہونی چاہیے۔" شیخ صاحب کہنے لگے۔

"آپ دوڑے ہُوئے آئے ہیں بابا؟ آپ کی کار کہاں گئی؟" ریحانہ اُن کی طرف مُنھ اُٹھا کر

بولی :

"بڑی شریر ہو ریحانہ! چلو فضّہ کو لے کر اپنے کمرے میں جاؤ اور تصویریں بناؤ۔ سب لڑکیاں سکول جا چکی ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" کنول آپا نے اُسے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ویسے آیا تو میں کار ہی میں ہوں بیٹا! میرا مطلب تھا کہ جلدی جلدی آیا ہوں۔" شیخ صاحب نے اس کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

ریحانہ چلی گئی تو شیخ صاحب نے باجی اور کنول آپا کے ساتھ ساری عمارت کو گھوم پھر کر دیکھا۔ ایک ایک دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ چھتوں کو گھور گھور کر دیکھا اور آخر فیصلہ کیا کہ یہ عمارت بچّیوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اِسے نئے سرے سے گرا کر بنایا جائے گا۔

"بارش ہوتی ہے تو چھتیں جگہ جگہ سے ٹپکنے لگتی ہیں۔" باجی نے شکایت کی۔

"صرف ٹپکتی ہی رہیں تو بھی غنیمت ہے، گریں نہیں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ بیچ میں جھول پڑ گئے ہیں اور خطرہ ہے کہ اب کے مینہہ برسا تو تو... یہ چھتیں نیچے آ رہیں گی۔" شیخ صاحب نے گھبرا کر کہا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" باجی نے پوچھا۔

"دیوان والی بڑی حویلی کے لیے درخواست دے رکھی ہے مگر کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ دس سال سے مقدّمہ چل رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ چھوٹی بچّیوں کے کھیلنے کے کمرے میں پہنچ گئے۔

"یہ کیا کر رہی ہو ریحانہ؟" باجی نے پوچھا۔ جب وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو ریحانہ چیزوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر اِدھر اُدھر کر

رہی تھی اور فِضّہ بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی
"جی، میں اپنی کرسی اور گڑیوں کا گھر اس
جگہ سے ہٹا رہی ہوں۔ چھت ان پر گری
تو ان کا تو کچومر ہی نکل جائے گا۔" ریحانہ
کے اس جواب پر شیخ صاحب کو بھی ہنسی آگئی
"نہیں منّی! چھت گرنے سے پہلے ہی ہم
تمھیں اور تمھاری چیزوں کو یہاں سے نکال کر
لے جائیں گے تم فکر نہ کرو۔" وہ بچّی کو تسلّی
دینے لگے۔ لیکن ساتھ ہی سوچ رہے تھے
کہ وہ وعدہ تو کر رہے ہیں مگر انھیں
نکال کر لے جائیں گے کہاں؟ یتیم خانے
کے لیے جو عمارت وہ مانگ رہے تھے وہ
تو مل نہیں رہی تھی۔ دس سال سے جھگڑا چل
رہا تھا۔ کسی لکھ پتی کارخانے دار نے اس
پر قبضہ کر رکھا تھا اور اس نے وہاں اپنا
گودام بنا لیا تھا۔
شیخ صاحب یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک دم

کود کر ایک طرف کو ہٹ گئے۔
"ارے! یہ کیا تھا؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھ
کر بولے۔
"چوہا تھا جی۔" فِضّہ نے بتایا۔
"ہمارے کمرے میں تو ننھّی مُنّی چوہیاں ہیں۔
یہ اِتنا بڑا چوہا آج خبر نہیں کہاں سے آگیا!"
ریحانہ کہنے لگی۔
"ارے! کیا چوہے بھی ہیں یہاں؟" شیخ صاحب
گھبرا کر پوچھنے لگے۔
"جی، بہت ہیں۔" باجی نے بتایا۔
"تو آپ نے انھیں مارنے کی کوشش نہیں
کی؟" شیخ صاحب پوچھنے لگے۔
"چوہے مارنے کی گولیاں اس ڈر سے نہیں
ڈال سکتے کہ کہیں کوئی بچّی اُٹھا کر نہ کھالے۔
ایک بار چوہے دان لگایا تھا تو فِضّہ نے
اپنی اُنگلی اس میں دبا لی تھی۔" کنول آپا
نے بتایا۔

"جی ، اُس میں ایک ننّی مُنّی چوہیا گھُس گئی تھی۔ میں اُسے نکالنے لگی تو میری اُنگلی دب گئی۔" فضّہ نے بتایا۔

"تم اُسے کیوں نکالنے لگی تھیں ؟ اُسے پکڑنے کے لیے ہی تو چوہے دان لگایا گیا تھا۔" شیخ صاحب خفا ہو کر بولے۔

"جی، وہ چوہا نہیں تھا۔ مُنّی سی چوہیا تھی۔ چمکتی ہُوئی آنکھوں والی۔" ریحانہ کہنے لگی۔

"اور جب چوہیاں پھنس جاتیں تو یہ لڑکیاں شور مچا دیتیں کہ انھیں مارا نہ جائے اور جب مہتر اُنھیں مارنے کو لے جاتا تو یہ سب اُداس ہو جاتیں۔" باجی نے کہا۔

"تو اسی لیے چوہوں کو پکڑنا چھوڑ دیا آپ نے؟" شیخ صاحب پُوچھنے لگے۔

"جی ہاں۔ اور کرتے بھی کیا ؟"

"اب تو چوہے اور بھی بڑھ گئے ہوں گے۔" شیخ صاحب بولے۔

"جی بہت" باجی نے جواب دیا۔

"رات کو ہمارے بستروں پر ڈھیر ساری چوہیاں دوڑتی پھرتی ہیں" ریحانہ خوش ہو کر بولی۔

"یہ تو بُری بات ہے۔ ان سے تو بیماری پھیلنے کا خطرہ ہے۔ پھر اُنھوں نے دیواروں اور چھتوں میں بل بنا بنا کر انھیں اور بھی کھوکھلا کر دیا ہو گا۔" شیخ صاحب بہت ہی فکر مند ہو گئے تھے۔

"جی ہاں۔ وہ تو ہے ہی۔" باجی نے جواب دیا۔

"ان بچّوں کو جلد سے جلد یہاں سے نکالنا چاہیے۔ میں جا کر کسی مکان کا اِنتظام کرتا ہوں۔" شیخ صاحب جاتے ہُوئے بولے۔

دوپہر کو شیخ صاحب کچھ مزدوروں کو ساتھ لے کر پھر آئے۔

"ابھی تو کوئی مکان ملنے کی اُمید نہیں۔ میں نے سوچا کچھ مرمّت کرا دی جائے۔ کم سے کم پرنالے ٹھیک کرا دیے جائیں تاکہ بارش کا

پانی چھت پر ٹھہرنے نہ پائے اور چھت نہ ٹپکے۔ اس طرح کچھ دن اور گزر جائیں گے اتنے میں مکان کی تلاش بھی جاری رہے گی۔" فرخندہ نے خوش ہو کر کہا۔

شیخ صاحب باجی سے کہہ رہے تھے۔

راج اور مزدور کام میں لگ گئے۔ لڑکیاں بھی ان کے گرد جمع ہو گئیں اور ان سے ذرا دور ہٹ کر باتیں کرنے لگیں۔

"یہ کون ہیں اور کیا کرنے آئے ہیں؟" فضہ پوچھنے لگی۔

"ارے! دیکھتی نہیں ہو، ان کے ہاتھوں میں زمین کھودنے والی چیزیں ہیں۔ یہ اب اس مکان کو گرا کر نیا مکان بنائیں گے۔" ریحانہ کہنے لگی۔

"کتنا مزہ آئے جب یہ لوگ زمین کھودیں تو اس میں سے ہیرے نکل آئیں، جیسے اس کہانی میں کنول آپا نے سنایا تھا۔" محمودہ تالیاں بجا کر بولی۔

"واہ! تمہیں اتنا بھی پتا نہیں؟ یہ کوئی عام مکان تھوڑا ہو گی۔ یہ تو خزانہ ہو گا۔ کہانی سے ہیرے ہوتے ہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔

"چلو نہ سہی کان، خزانہ ہی نکلے۔ پھر تو ہمارے رہنے کو بڑا ہی پیارا گھر بنوائیں گے شیخ صاحب۔" فرخندہ نے کہا۔

کچھ بچیاں مزدوروں کے قریب پہنچ گئیں۔ مزدور ان ننھی منی سی چونچال اور پھولوں کی طرح کھلی کھلی بچیوں کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"تم یہاں بہت خوش ہو، بچیو؟" ایک مزدور نے پوچھا۔

"ہاں! ہم یہاں بہت خوش ہیں۔" ریحانہ کہنے لگی۔

"کیا ہُوا اگر یہ ٹُوٹا پھُوٹا گھر ہے۔ مگر ہم یہاں بہُت خُوش ہیں۔" فِضّہ نے کہا۔

"اور ننھّی، تُم کھاتی کیا ہو کہ اِتنی موٹّی ہو ہو رہی ہو؟" مزدُور ہنس کر پُوچھنے لگا۔

"بہُت کچُھ کھاتی ہُوں ہیں۔ باجی مجھے سارا دِن کچُھ نہ کچُھ کھانے کو دیتی رہتی ہیں۔" فِضّہ نے بتایا۔

"تمھارے گھر میں بھی بچّے ہیں؟" ریحانہ پُوچھنے لگی۔

"بہت بچّے ہیں۔" مزدُور اُداس ہو کر بولا۔

"تو کیا تُمھیں اچھّے نہیں لگتے بہُت سے بچّے" ریحانہ پُوچھنے لگی۔

"نہ" مزدُور نے جواب دیا۔

"عجیب آدمی ہو کہ تمھیں بچّے اچھّے نہیں لگتے۔" فِضّہ نے گھُور کر مزدُور کی طرف دیکھا۔

"ہماری باجی اور کنول آپا کو تو بہُت بچّے ہیں؟" فرخندہ پُوچھنے لگی۔

اچھّے لگتے ہیں۔" ریحانہ کہنے لگی۔

"ہاں! مگر ڈھیروں بچّے تو اچھّے نہیں لگتے نا!" مزدُور ہنس کر کہنے لگا۔

"تمھارے ہاں کیا بیس[20] سے بھی زیادہ بچّے

"ارے! ارے! نا بابا! خُدا نہ کرے جو اِتنے بچّے ہوں۔" مزدُور نے کانوں پر ہاتھ دَھر کر کہا۔

"دیکھ لو ہم بیس ہیں، پھر بھی ہمیں سب پیار کرتے ہیں۔" ریحانہ نے بتایا۔

"بی بی! تُم تو ساری قوم کے بچّے ہو۔ کِسی ایک آدمی کے بچّے نہیں۔ تمھیں پیار کرنا ہم سب کا فرض ہے۔" دُوسرے مزدُور نے کہا۔

اِتنے میں باجی اس طرف آ نکلیں۔ وہ مزدُوروں کو باتیں کرتے دیکھ کر خفا ہونے لگیں۔ بولیں:

"بھئی، یہ کیا ہے کہ تُم میں سے دو آدمی کام کرتے ہیں تو تیسرا اُن کو کھڑا دیکھا کرتا ہے؟ یہ کام جلد ختم ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بارش شرُوع ہو جائے اور بچّوں کو تکلیف ہو۔"

وہ بچّیوں کو وہاں سے لے گئیں اور مزدُور اپنے کام میں لگ گئے۔

ننّھا مُنّا بھائی

کھانے کو دیر ہو گئی تھی اور تنوُر والی روٹیاں لے کر نہ آئی تھی۔ بچیاں مارے بھُوک کے تلملا رہی تھیں۔ فضّہ کو تو باجی نے بسکُٹ دے کر بہلانا چاہا مگر اُسے دُوسری بہنوں کا بھی خیال تھا۔ جب وہ تیسری بار دروازے پر تنوُر والی کو آواز دے کر آ رہی تھی تو باجی نے کہا:

"تُم کہاں گئی تھیں اِتنی دُھوپ میں؟"

"جی، میں دیکھنے گئی تھی کہ تنوُر والی آ رہی ہے یا نہیں؟"

"تمھیں بھُوک لگ رہی ہے؟"

"اور سب لڑکیوں کو لگ رہی ہے۔"

"یہ تنوُر والی بڑی بُری ہے۔ کبھی روٹیاں جلا دیتی ہے کبھی اِتنی دیر کر دیتی ہے۔" جمیلہ نے بسُور کر کہا۔

"باجی! اُس دِن اُس نے روٹیاں جلا دیں تو ہم نے اُس سے کہا کہ وہ روٹیاں لگانے والے آدمی کو نِکال کیوں نہیں دیتی۔" فرخندہ بولی۔

"پھر اُس نے کیا کہا؟" باجی نے ہنس کر پُوچھا۔

"کہنے لگی، کیسے نِکالوں بی بی! وہ تو میرا گھر والا ہے۔"

فرخندہ کے اس جواب پر باجی اور کنول آپا ہنسنے لگیں۔ اِتنے میں کِسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ باجی نے کہا "دیکھنا تو ذرا، شاید تنوُر والی ہو گی۔"

"کوئی نہ جائے۔ میں جاؤں گی۔" فِضّہ جلدی سے بولی۔

فِضّہ دروازے پر پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ دروازے کے اندر ایک ٹوکری رکھی ہے۔ وہ دوڑ کر آگے بڑھی۔ جھانک کر ٹوکری کے اندر

دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اِتنی حیران کہ چند سیکنڈ تک تو کچھ بول نہ سکی۔ پھر ایک دم چیخی:

"باجی! باجی! آیئے تو ذرا۔ یہاں ٹوکری میں ایک بچّہ پڑا ہے۔ ہائے! اتنا مُنّا سارا بچّہ!"

جب اس کی آواز کسی نے نہ سُنی تو اُس نے لپٹے لپٹائے بچّے کو ٹوکری میں سے اُٹھا لیا، جس کا کالے کالے گھُنگھریالے بالوں والا سر کپڑے سے باہر تھا۔ باقی سارا جسم موٹے کپڑے میں لپٹا ہُوا تھا۔ وہ ٹوکری کو دونوں

ہاتھوں سے پکڑے بڑی مُشکل سے چل رہی تھی۔

"ارے! یہ کیا لیے آ رہی ہو؟ کیا روٹیاں ہیں؟" جمیلہ نے پوچھا جو اُس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"روٹیاں نہیں بچّہ ہے۔ دروازے کے اندر ٹوکری میں پڑا تھا۔ میں کھیلنے کے لیے اُٹھا لائی۔" فِضّہ نے خوشی کے مارے چیخ کر کہا۔

"بچّہ! ہائے! اسے ٹوکری میں کِس نے رکھ دیا؟" فاطمہ نے آگے بڑھ کر فِضّہ کے ہاتھوں سے ٹوکری لے لی اور تینوں کمرے میں آ گئیں۔

باجی اور کنول آپا بچّے کو دیکھ کر بہت حیران ہوئیں کیوں کہ اِس طرح آج تک اُن کے ہاں کوئی بچّہ نہیں آیا تھا۔ باجی نے جب تک فاطمہ کی گود سے بچّے کو لیا، فِضّہ نے سارا قِصّہ سُنا دیا۔

"فِضّہ! دوڑو۔ باہر جا کر چاروں طرف نظر دوڑاؤ۔ اگر کوئی ایسی عورت دِکھائی دے جو اس بچّے کی ماں معلوم ہو تو اُسے بُلا لاؤ۔" باجی نے گھبرائی ہُوئی آواز میں کہا۔

فِضّہ دروازے کی طرف دوڑی۔ باہر نِکل کر کبھی اِدھر دیکھتی کبھی اُدھر۔ مگر اُسے کوئی بھی ایسی عورت دِکھائی نہ دی جسے وہ اُس بچّے کی ماں سمجھ سکتی۔ قریب کے ایک سکُول کی اُستانی سائیکل پر جا رہی تھی۔ ایک بہت بُوڑھی عورت تین کُتّوں کو بڑی اِحتیاط سے آگے آگے چلاتی لیے جا رہی تھی۔ دو سپاہی خاکی وردی پہنے سامنے سے گزر رہے تھے۔ فِضّہ حیران سی کھڑی دیکھتی رہی پھر خود بخود بڑبڑائی:

"ان میں سے تو کوئی بھی بچّے کی ماں نہیں ہے۔" اور وہ جلدی جلدی باجی کے پاس واپس پہنچ گئی۔

"وہاں تو کوئی بھی بچّے کی ماں معلوم نہیں ہوتی - باجی! اِتنا پیارا سا تو مُنّا ہے۔ کیا ہم اسے اپنے ہاں نہیں رکھ سکتے؟ میری اچھّی اچھّی سی باجی! رکھ لیجیے نا اسے۔ ہمارے پاس کوئی بھی چھوٹا بچّہ نہیں۔" فِضّہ باجی کی ٹانگوں سے لپٹ کر خوشامد کر رہی تھی۔

"ہاں! تمھارے بعد ہمارے پاس کوئی چھوٹا بچّہ نہیں آیا۔ جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اسے رکھ لوں لیکن شیخ صاحب اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ لڑکا ہے۔"

"کیوں؟ کیا لڑکے اچھّے نہیں ہوتے؟" فِضّہ پُوچھنے لگی۔

"یہ بات نہیں۔" شیخ صاحب نے لڑکوں کے لیے الگ جگہ بنا رکھی ہے۔ انھیں وہیں رکھا جاتا ہے۔" باجی نے جواب دیا۔

چند مِنٹ تک بچّیاں چُپ کی چُپ رہ گئیں لیکن ریحانہ نے جلد ہی اِس مُشکل کا حل سوچ لیا۔ وہ بولی:

"تو شیخ صاحب کو نہ بتایئے کہ ہمیں لڑکا مِلا ہے۔ ان سے یہی کہنا کہ لڑکی ہے۔"

باجی بولیں "نہیں بیٹا! ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ کنول! ہمیں سب سے پہلے تو پولیس کو ٹیلی فون کر کے اِطّلاع دینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے پولیس اس کی ماں کو تلاش کر لے۔"

"خدا کرے نہ ہی ملے۔ پھر ہم اسے رکھ لیں گے۔" فِضّہ کہنے لگی۔

باجی نے شیخ صاحب کو ٹیلی فون کر کے بتایا۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ بچّے کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ پولیس کو بھی اطّلاع کر دیں گے۔ کوئی گھنٹا بھر گزرا ہو گا کہ

شیخ صاحب پولیس انسپکٹر کو ساتھ لے کر آ پہنچے۔ اِنسپکٹر نے ساری باتیں لِکھ لیں اور بچّے کی ماں کو ڈھونڈنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

شیخ صاحب نے باجی سے کہا "اتنے چھوٹے بچّے کو میں ابھی لڑکوں کے یتیم خانے میں نہیں لے جا سکتا۔ جب تک اس کے ماں باپ کا پتا نہ چل جائے آپ اسے اپنے پاس ہی رکھیں۔"

شیخ صاحب کے اس فیصلے پر سب بچّیاں تالیاں بجا بجا کر اُچھلنے لگیں۔ فِضّہ اور ریحانہ بہت ہی خوش ہُوئیں اور مارے خوشی کے شیخ صاحب سے لپٹ گئیں۔

"آغّا جی! منّا بھیّا ہمارے پاس رہے گا۔ ہم اسے کھلائیں گے۔ وہ اُچھل اُچھل کر کہنے لگیں۔

"اور اگر پولیس نے اس کی ماں کو ڈھونڈھ

نِکالا تو پھر کیا کرو گی؟" شیخ صاحب نے ہنس کر پُوچھا۔

"اِتنے سارے لوگوں میں پولیس کو کیسے معلوم ہو گا کہ کون مُنّے کی ماں ہے؟" ریحانہ نے کہا۔

"یہ سچ مُچ سوچنے کی بات ہے۔ خیر، ابھی تو تُم مُنّے کو کھلاؤ۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ بے چارہ بھی اب تمھارے ساتھ اس مکان میں رہے گا جس کی چھت ٹپکتی ہے اور دیواریں گرنے کو ہیں۔"

مُنّی کا دانت نکلا

باجی شیخ صاحب کو دروازے تک چھوڑ کر واپس آئیں تو اِتنے میں فِضّہ نے مُنّے کا نام بھی رکھ لیا۔

"ککّی! ککّی!" وہ تالیاں بجا بجا کر اُسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ رو رہا تھا۔

شاید اُسے بھُوک لگ رہی تھی۔

"باجی! اس کا کوئی اچھّا سا نام رکھیے نا۔" کنول آپا مُنّے جُھلاتے ہُوئے بولیں۔

"نام رکھ تو لیا۔ ہم تو بس اسے گگّی کہا کریں گے۔ کیوں باجی جان؟"

"گگّی تو کوئی نام نہیں۔ کوئی اچھّا سا نام رکھیں گے اس کا۔" باجی بچّے کو کنول آپا سے لیتے ہُوئے کہنے لگیں۔

"نہیں باجی! اُوں اُوں! ہم نہیں مانتے۔ بس گگّی ہی ٹھیک ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے۔" فِضّہ نے ضِد کرتے ہُوئے کہا۔

"اچھّا بھئی، تم گگّی ہی کہنا مگر اس کا اصل نام محمّد علی ہو گا۔" باجی نے ایک دم فیصلہ کر دیا۔

بچّے کا نام محمّد علی رکھ تو دیا گیا مگر سب اسے گگّی ہی کہہ کر پُکارتے۔ ان کو ایک جِیتا جاگتا کِھلونا مِل گیا تھا۔ چند ہی

دِنوں میں وہ ان کو اِتنا پیارا ہو گیا کہ اب تو باجی اور کنول آپا بھی اس خیال سے پریشان ہو جاتیں کہ اگر پولیس نے گگّی کی ماں کو ڈھونڈھ نکالا تو وہ کیسے اس سے الگ ہو سکیں گی۔

فِضّہ تو اسے خاص طور پر اپنا چکی تھی۔ اور اس پر سب سے زیادہ حق اپنا ہی سمجھتی تھی کیوں کہ اس مُنّے سے پیارے کھلونے کو اسی نے پڑا پایا تھا۔ وہ اسے نہلاتے دُھلاتے اور کپڑے بدلواتے وقت کنول آپا کے سر پر سوار رہتی اور گگّی کے ہر کام میں اُن کا ہاتھ بٹانے کی ضِد کرتی۔

گگّی چند ہی دِنوں میں خوب موٹا تازہ ہو گیا اب تو اُس کی رنگت بھی نِکھر گئی تھی۔ خُوب زور زور سے ہمکتا اور آغُوں آغُوں کر کے مُسکراتا تھا۔ سب بچّیاں سکول

چلی جاتیں تو فِضّہ گگّی کے جھُولے پر جھُکی ہُوئی اس سے باتیں کیا کرتی۔ یہ جھُولا بھی فِضّہ کا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو یہ اسی کے لیے خریدا گیا تھا اور اب چار سال کے بعد پھر گودام سے نکلوایا گیا تھا۔

جب کنول آپا مُنّے کے سویٹر کے لیے سفید اُون لے کر آئیں تو فِضّہ نے اِنتظار شُروع کر دیا کہ کب سویٹر ختم ہو اور کب گگّی کو پہنایا جائے۔ وہ ایک پل کے لیے بھی کنول آپا کو سِلائیوں کے بغیر دیکھتی تو جھٹ اُن کی چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹوکری لے کر ان کے سر پر پہنچ جاتی۔

"کنول آپا! آپ مُنّے کا سویٹر بنائیے اور کوئی کام نہ کیجیے۔"

اور جب ایک دِن باجی کباڑیے کی دُکان سے ایک ہلکی پھُلکی گاڑی لے آئیں تو فِضّہ کی تو عید ہو گئی۔ گگّی اب موٹا اور بوجھل ہو گیا تھا اور فِضّہ سے اُٹھایا نہ جاتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ناچنے لگی کہ اب وہ گگّی کو گاڑی میں لٹا کر باغیچے میں لے گھُومے پھرے گی۔ بید کی بنی ہُوئی یہ گاڑی، جس پر چھاؤں کرنے کے لیے باجی نے

ایک پُرانا لیمپ شیڈ لگا دیا تھا، اِتنی ہلکی پھلکی تھی کہ فِضّہ اسے آسانی سے لیے پھرتی۔

ایک دِن کنول آپا بچّیوں کو دست کاری کی نمائش دِکھانے لے چلیں۔ سب بچّیاں خُوش تھیں مگر فِضّہ چُپ کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

"گگّی نہیں جائے گا باجی؟ اُس نے پُوچھا۔

"گگّی ابھی ایسی چیزوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ پھر کیا فائدہ اسے لے جانے کا؟ یہ میرے پاس ہی رہے گا۔" باجی کہنے لگیں۔

"آپ اس کا اچھّی طرح خیال رکھیے باجی! کہیں جھُولے میں سے گِر نہ جائے۔"

فِضّہ کی بات سُن کر باجی اور کنول آپا ہنسنے لگیں۔

"میں نے تُم سب کو بغیر خیال رکھے ہی پالا ہے کیا؟ ایک بار بھی کِسی بچّی کو گِرنے دیا ہے؟" باجی پُوچھنے لگیں۔

فِضّہ چُپ ہو گئی اور کپڑے پہننے کے لیے چلی گئی۔ مگر جب بچّیاں جانے کے لیے نِکلیں تو گگّی نے رونا شرُوع کر دیا۔

"ہائے! میں اسے روتا چھوڑ کر گئی تو سارا وقت یاد آتا رہے گا۔ نہ بھائی! میں نہ جاؤں گی اپنے بھیّا کو چھوڑ کر۔" فِضّہ دوڑتی ہوئی گگّی کے پاس آ گئی۔

"چلو تمھاری مرضی۔" باجی نے کہا۔

کنول آپا لڑکیوں کو لے کر چلی گئیں۔

فِضّہ گگّی کو باجی کی مدد سے گاڑی میں لِٹا کر باغیچے میں لے گئی مگر گگّی نے تو جیسے چُپ نہ ہونے کی قسم کھا لی تھی۔ بس روتا ہی چلا جاتا تھا۔ فِضّہ پُچکارتی مگر وہ اور بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چِلّاتا۔ اُس نے لاکھ جتن کیے کہ گگّی چُپ ہو جائے مگر وہ تھا کہ ایک نہ سُنتا تھا۔

گاڑی دھکیلتے دھکیلتے بے چاری فِضّہ تنگ آ گئی۔ اب تو وہ دِل ہی دِل میں پچھتا رہی تھی کہ کیوں نہ وہ بھی سب کے ساتھ نُمائش دیکھنے چلی گئی۔ آخر باجی نے آ کر بچّے کو لے لیا اور فِضّہ کو اندر جا کر آرام کرنے کی تاکید کی۔ مگر فِضّہ اکیلے گھر میں بُری طرح گھبرا رہی تھی۔

وہ بہت دیر تک کاغذ کاٹ کاٹ کر گُڑیاں بناتی رہی۔ آخر اس کھیل سے بھی تنگ آ گئی۔ دوپہر تھی کہ کاٹے نہ کٹ رہی تھی۔ اِتنا لمبا دِن فِضّہ نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔

آخر خدا خدا کر کے لڑکیاں واپس آئیں۔ اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور مارے خُوشی کے مُنھ لال بھبوکا ہو رہے تھے۔

"ہائے فِضّہ! تم نہ گئیں۔ ہم نے ایسی

اچھّی اچھّی چیزیں دیکھیں کہ بس کیا بتائیں۔" ریحانہ کہنے لگی۔

"ہم کشتیوں میں بیٹھے جو روشنیوں سے جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔" محمُودہ نے بتایا۔

بے چاری فِضّہ لڑکیوں کی سیر کا حال سُنتی تو اس کے دِل میں ہُوک سی اُٹھتی اور وہ سوچتی کاش! میں ان کے ساتھ گئی ہوتی لیکن وہ اُن پر یہ ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ نہ جانے پر افسوس کر رہی ہے۔ اس لیے خُوش ہو ہو کر ان کی باتیں سُن رہی تھی مگر شام کو جب ککّی دُودھ کی بوتل مُنھ سے نکال نکال دیتا اور روتا ہی چلا جاتا تو وہ تنگ آ کر بولی:

"تمُھارے جیسے لڑکے کے لیے میں نے فضُول اپنی سیر کھوئی۔"

لیکن باجی ککّی کے یوں لگاتار رونے پر پریشان تھیں کہ ضرُور اسے کوئی تکلیف ہے۔

نہیں تو اس طرح رونا اس کی عادت نہیں تھی۔ اُنھوں نے اس کے مُنھ میں اُنگلی ڈالی کر اُس کے مسوڑھوں کو ٹٹولا تو ایک دم خوشی کے مارے چیخ اُٹھیں۔

"آہا! مجھے پہلے ہی شک تھا۔ گگّی کا دانت نِکل رہا ہے۔"

"ہائے میرا مُنّا بھیّا!" فِضّہ بولی "شکر ہے میں اس کے پاس رہ گئی تھی۔ چلی گئی ہوتی تو غریب کو اکیلے ہی دانت نکالنا پڑتا۔"

اُس کی بات سُن کر لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ مگر ان سب کو گگّی اِتنا پیارا تھا کہ دانت نِکلنے کی تکلیف کا خیال کر کے وہ بہت جلد فِضّہ کی بات بھُول گئیں اور گگّی کی فِکر کرنے لگیں۔ ایک دانت نِکلنے میں اُسے اِتنی تکلیف ہُوئی کہ وہ دِن بھر رویا کیا۔ اتنے سارے دانت نِکلتے

تو وہ بے چارہ بے حال ہو جائے گا۔ اسی کے متعلق وہ رہ رہ کر باجی اور کنول آپا سے پُوچھتیں۔

"ارے! تم لوگوں کے بھی تو آخر اسی طرح دانت نِکلے تھے۔ گگّی کوئی نرالا بچّہ تو نہیں ہے۔ تمھیں بھی اسی طرح تکلیف ہُوئی تھی۔" باجی نے کہا۔

پھر تو آئے دِن یہی ہوتا کہ گگّی رویا کرتا اور باجی کچھ بھی نہ کر سکتیں۔

ایک رات گگّی کے رونے کی آواز سُن کر فِضّہ کی آنکھ کھُل گئی۔ باجی کے کمرے سے لگاتار گگّی کی چیخیں سُنائی دے رہی تھیں اور کِسی کی آواز نہ آتی تھی۔

وہ آہستہ سے بستر میں سے نِکلی اور اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہُوئی باجی کے کمرے کی طرف چلی مگر اندھیرے کی وجہ سے غلط موڑ مُڑ گئی اور باجی کے کمرے کی جگہ

Market,
Karachi-18.

سیڑھیوں کی طرف ہو لی ۔ چلتے چلتے اس کا
پیر لپٹا ۔ اس نے سہارے کے لیے اِدھر اُدھر
ہاتھ مارے مگر سنبھل نہ سکی ۔ اس کے
ہاتھ سیڑھیوں کے سِرے پر دونوں طرف
رکھے ہُوئے گملوں پر پڑے "اڑاڈا دھم ۔
اڑا اڑا دھم ! ٹھا .. ۔ ٹھس ۔" کی آوازیں ،
اندھیرے میں سیڑھیوں پر سے لُڑھکتی ہُوئی
فِضّہ کو سُنائی دے رہی تھیں ۔ گملے اس
کے آگے آگے لُڑھک رہے تھے ۔ فِضّہ اُن
کے پیچھے پیچھے لُڑھکتی ہُوئی اُن کے اُوپر
جا گِری ۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہُوا ؟
اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں اور رگڑیں
لگ گئی تھیں ۔ اس نے پُورے زور سے
گلا پھاڑ کر چلّانا شُروع کیا ۔ چاروں طرف
گھُپ اندھیرا تھا ۔ جلدی ہی اُسے اپنی
چیخوں میں ہلی جُلی اور آوازیں سُنائی دینے

لگیں ۔ گھر میں سب لوگ جاگ گئے تھے ۔
دروازوں کے دھما دھم کھُلنے اور بند ہونے
کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ ہڑبڑی میں سب
ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے ۔ باجی کی آواز
سب سے اُونچی تھی :

"ارے غضب ہو گیا ! بچّوں کے اُوپر چھت
گِر پڑی ۔"

یہ سُن کر فِضّہ نے اور بھی دہاڑیں مار مار
کر رونا شُروع کر دیا مگر اِتنے میں سیڑھیوں
پر ہلکی سی روشنی نظر آئی ۔ بچّوں کے کمرے کی
چھت کو صحیح سلامت دیکھ کر باجی کے
حواس ٹھیک ہُوئے تو اُنھوں نے اندازہ
لگایا کہ رونے کی آواز نیچے کی منزل سے
آ رہی ہے ۔ اُنھوں نے فِضّہ کی آواز پہچان
بھی لی تھی ۔ وہ ٹارچ لیے ہُوئے نیچے دوڑیں
کہ کنول آپا ابھی تک بدحواسی سے اِدھر
اُدھر دوڑ رہی تھیں ۔ باجی کو نیچے جاتے

دیکھ کر وہ چلّانے لگیں۔
"ہائے ہائے سیڑھیاں گر پڑی ہیں۔ ا
طرف مت جاؤ۔"
"سیڑھیاں فضّہ پر گری ہیں کنول آپا! ہا
ہائے اب کیا ہو گا! یہ تو فضّہ کے رو

کی آواز ہے۔ وہ سیڑھیوں میں دبی ہُوئی رو
رہی ہے۔" ریحانہ نے رو رو کر سب لڑکیوں
کو جمع کر لیا۔
"تمھیں کس نے بتایا؟" کنول آپا چیخیں۔
"وہ اپنے بستر میں جو نہیں ہے۔" ریحانہ
نے کہا۔
باجی نے ٹارچ کی مدّھم روشنی میں دیکھا کہ
فضّہ ٹوٹے ہُوئے گملوں کے ٹکڑوں پر پڑی
ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔
"جی، سیڑھیاں مجھ پر نہیں گریں۔ میں سیڑھیوں
پر گری ہُوں اور ٹوٹ پھوٹ کر خبر نہیں
کتنے ٹکڑے ہو گئے ہیں میرے۔" وہ ٹوٹے
ہُوئے گملوں کے ٹکڑوں کو چھُو کر بولی۔ انھیں
وہ اپنے ٹکڑے سمجھ رہی تھی۔ باجی جلدی جلدی
نیچے اُتریں۔ بجلی کا بٹن دبا کر بتّی جلائی
اور فضّہ کو گود میں اُٹھا کر اُوپر آئیں۔
اُسے کچھ چھوٹی موٹی خراشوں کے سوا کچھ

نُقصان نہ پہنچا تھا۔ باجی نے اس کی خراشو
پر پسرٹ لگائی۔ کلائی پر ایک زخم سے خو
نِکل رہا تھا، اس پر مرہم لگا کر پٹی باندھ
دی۔ فِضّہ ابھی تک رو رہی تھی۔ باجی او
کنول آپا اُسے بہلا رہی تھیں۔

"بھئی اب تو شیخ صاحب کو اس گھر کی
مرمّت جلد کرا دینی چاہیے۔ یہ چھت اور
سیڑھیاں بڑی خطرناک ہیں۔ باجی اپنے چھوٹے
چھوٹے بالوں کو سمیٹتے ہُوئے کہہ رہی تھیں۔

"مگر چھت اور سیڑھیاں کوئی گِری تھوڑا ہی
ہیں۔" کنول آپا نے ہنسی روک کر کہا۔

"لیکن ہمیں تو یہی وہم ہُوا نا۔ میں تو مارے
ڈر کے مر ہی گئی ہوتی۔ اب تو شیخ صاحب
کو ضرُور ہی انھیں ٹھیک کرانا ہو گا۔ نہیں
تو ایک رات اور ایسی گڑبڑ ہُوئی تو میری
جان ہوا ہو جائے گی۔ سچ کہتی ہُوں۔" باجی
کہہ رہی تھیں۔

"اور میں بھی اب کے بچ نہ سکوں گی۔"
فِضّہ کراہتے ہُوئے بولی۔
باجی نے کمرے کی بتّی بجھا کر سب کو
اپنے اپنے بستر پر جانے کا حُکم دیا اور خود
فِضّہ کا سر سہلا کر اُسے سُلانے کی کوشش
کرنے لگیں۔

بے چارہ گُلّی

صبح باجی نے سب سے پہلا کام یہ کیا
کہ ٹیلی فون کر کے شیخ صاحب کو بُلایا۔ وہ
آئے تو انھیں رات کا سارا حال سُنایا گیا مگر
وہ فِکر مند ہونے کے بجائے خوشی سے پھُولے
نہ سمائے۔ بولے:

"دیکھا نا! اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اس
عمارت کی جلد مرمّت کرائی جائے یا اسے
چھوڑ کر کوئی اور جگہ لے لی جائے۔ میں
تو پُوری کوشش کر رہا ہوں مگر یتیم خانے

کی کمیٹی کے ممبر سُنتے ہی نہیں ۔ اب میں
آپ سے ایک درخواست لکھوا کر دُوں
جس میں آپ رات کا یہ سارا واقعہ بیا
کریں ۔ مجھے ایک بہت اچھّی تدبیر سُوجھ
ہے ۔" شیخ صاحب ہنس ہنس کر کہہ رہ
تھے اور باجی ان کا مُنہ تک رہی تھیں
کچھ دیر چُپ رہ کر شیخ صاحب بولے :
"ہاں ! تو یہ سب ہنگامہ اس لیے ہُو
کہ وہ لڑکا رو رہا تھا ؟ میرا خیال ہے
اب وہ اِتنا بڑا ہو گیا ہے کہ لڑکو
کے یتیم خانے میں رہ سکے ۔ میں اس ک
اِنتظام کر رہا ہُوں ۔"
"جی ، اُس کے دانت نِکل رہے ہیں
باجی چونک کر بولیں ۔
"تو پھر کیا ہُوا ؟ نِکلتے رہیں ۔" شیخ صاح
بے پروائی سے بولے ۔
"دانت نِکل لیں تو پھر لے جایئے اُ

باجی نے کہا ۔
"ہیں ! تو کیا لڑکوں کے یتیم خانے میں
اس کے دانت نہیں نِکل سکتے ؟" شیخ صاحب
نے کہا اور جانے کے لیے اُٹھے ۔
"میرا خیال ہے ابھی گُگّی کو نہ لے جایئے
شیخ صاحب !" باجی نے ان کی منّت کی ۔
"جی نہیں ۔ میں تو اُس لڑکے کا ذکر کر رہا
ہُوں ۔ گُگّی کون ہے ؟" وہ پُوچھنے لگے ۔
"اُسی کا نام تو گُگّی ہے ۔" باجی نے بتایا ۔
"پہلے تو آپ نے کچھ اور نام بتایا تھا ۔
مجھے اچھّی طرح یاد ہے یہ نام نہیں تھا ۔"
"جی ہاں ! اس کا اصلی نام تو محمّد علی ہے
مگر بچّیوں نے پیار سے اُسے گُگّی کہہ کر
پُکارنا شروع کیا تو یہی نام پڑ گیا ۔" باجی
نے بتایا ۔
"وہ اُسے لڑکیوں جیسے نام سے پُکارنا
چاہتی ہیں ۔ جب ہی تو میں چاہتا ہُوں

کہ اُسے لڑکوں کے یتیم خانے میں بھیج دیا ہے۔ جگہ بدل گئی تو اور بیمار ہو جائے گا۔"
جائے تاکہ اُس میں لڑکیوں جیسی عادتیں پیدا جی نے کہا۔ شیخ صاحب کچھ سوچنے لگے۔
نہ ہو جائیں۔"
"تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟ جب اس
"لڑکیوں کی عادتیں بُری تو نہیں ہوتیں کے دانت نِکل آئیں تو اُسے لے جایا جائے؟"
باجی نے ہنس کر کہا۔ ہ پُوچھنے لگے۔
"لڑکیوں میں لڑکوں جیسی عادتیں ہوں تو "جی ہاں! بلکہ میری مرضی پُوچھئے ہیں تو میں
اچھّی نہیں ہوتیں اور لڑکوں میں لڑکیوں کی چاہتی ہُوں کہ اُسے یہیں رہنے دیا جائے۔
عادتیں ہونا ٹھیک نہیں ہوتا۔" شیخ صاحب یاں اُسے اس قدر پیار کرتی ہیں کہ اُس
نے کہا۔ باجی چُپ ہو رہیں۔ سے الگ ہونا ان کے لیے بڑا مشکل ہوگا۔"
"ہاں تو، جلدی سے لے آیئے بچّے کو۔" شیخ صاحب ایک دم چونکے "جی؟ کیا
شیخ صاحب ایک ہی بات پر اڑ گئے تھے ما آپ نے؟ نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں
گُڈّی سے جُدا ہونے کے خیال سے باجی کا سکتا کہ کوئی لڑکا لڑکیوں کے یتیم خانے
دل ہول کھانے لگا تھا اور پھر انھیں ں رکھا جائے۔ جیسے ہی اس کے پُورے
بچّیوں کا بھی خیال تھا کہ وہ گُڈّی کے بغیر نت نِکل آئیں اُسے فوراً اس جگہ سے
کیسے رہ سکیں گی۔ ے جانا ہو گا۔"
"شیخ صاحب! میں نے عرض کیا تھا کہ گُڈّی باجی کو چُپ ہونا پڑا۔ یہی کیا کم تھا کہ
کو ابھی یہیں رہنے دیجیے۔ اس وقت وہ نت نکلنے تک شیخ صاحب نے بچّے کو

وہاں رکھنے کی اِجازت دے دی تھی۔

جھُولے والا

گرمی کا موسم آ گیا مگر ککّی کے ابھی تک دانت نِکل رہے تھے۔ شاید اُسے معلُوم ہو گیا تھا کہ دانت نِکل چکنے کے بعد اُسے اس گھر سے رُخصت ہونا پڑے گا۔

ایک دن موسم بڑا اچّھا تھا۔ بادل گھِرے ہُوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ باجی نے کنول آپا سے کہا کہ وہ بچّوں کو شالامار باغ لے جائیں۔ فضّہ نے ککّی کی گاڑی ہولے ہولے دھکیل رہی تھی کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ وہ ککّی سے باتیں کر رہی تھی اور جو چیز دیکھتی اُسے بھی بتاتی:

"دیکھو ککّی! درختوں میں نئے پتّے نِکل رہے ہُوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ باجی ہیں، جیسے تمھارے دانت نِکل رہے ہیں۔ نے کنول آپا سے کہا کہ وہ بچّوں کو شالامار باغ لے جائیں۔ فضّہ نے ککّی کی گاڑی ہولے ہولے دھکیلنے لگی۔ کنول آپا بچّیوں کو بڑی پیارے پھُول۔"

سڑک سے ہٹا کر فٹ پاتھ پر لے آئیں۔ وہ گردن ہلا ہلا کر ککّی سے باتیں کرتی چلی شالامار باغ ان کے یتیم خانے کی عمارت سے آتی۔ وہ کِلکاریاں مار مار کر ہنستا اور پھُولوں

جھ زیادہ دُور نہ تھا۔ جلد ہی وہ باغ کی یوڑھی میں داخل ہو گئیں۔ لڑکیاں روشوں ر اور گھاس والے کھُلے لانوں میں دوڑنے جرنے لگیں۔ فضّہ ککّی کی گاڑی ہولے ہولے ھکیل رہی تھی کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ وہ لکّی سے باتیں کر رہی تھی اور جو چیز دیکھتی سے بھی بتاتی:

نی برس رہا ہے۔ افوہ! کتنے ڈھیروں پھُول

اِجازت دے دی۔

فضّہ نے ککّی کو گاڑی میں بٹھا لیا اور خود لگے ہیں۔ لال، پیلے، نیلے، اُودے۔ پیارے گاڑی دھکیلنے لگی۔ کنول آپا بچّیوں کو بڑی پیارے پھُول۔"

کی طرف ہاتھ لپکاتا۔

"تمھارے باغ میں اِتنے ڈھیروں پھول ہیں مالی بابا! کیا ہم بچّے کے لیے کچھ پھول لے سکتے ہیں؟" فِضّہ نے مالی سے پوچھا۔

"بی بی! پھول توڑنے کی اِجازت نہیں مگر تم مجھے اچّھی بچّی معلوم ہوتی ہو کہ تم نے پوچھ لیا۔ اِسی لیے میں تمھیں گُل دستہ بنا کر دُوں گا۔" مالی نے خوش ہو کر کہا۔ فِضّہ بچّے کو لیے پاس کھڑی رہی اور مالی نے ایک بہت بڑا گُل دستہ بنایا اور ککّی کی گاڑی میں رکھ دیا۔ پھر اس نے فِضّہ کو پیار کرتے ہُوئے کہا "جاؤ گھوم پھر آؤ۔ واپس آؤ گی تو میں تمھیں پھل بھی دُوں گا۔"

فِضّہ مالی کا شُکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گئی۔ کنول آپا سیڑھیوں کے قریب اس کا اِنتظار کر رہی تھیں، کیوں کہ دُوسرے لان میں جانے کے لیے سیڑھیاں اُترنی پڑتی تھیں۔

وہ ککّی کی گاڑی کو دیکھ کر حیران ہُوئیں۔

"کنول آپا! میں نے پھول خود نہیں توڑے مالی بابا نے دیے ہیں۔" فضّہ نے دُور ہی سے پُکار کر کہا۔ پھر نیچے دیکھ کر بولی: "آہا! وہاں تو جھُولے پڑے ہیں۔ یہ باجا کون بجا رہا ہے؟"

"جھُولے والا بجا رہا ہے۔ کنول آپا نے جواب دیا۔

"آہا! کتنی پیاری پیاری موٹریں لگی ہیں اس جھُولے میں۔" فِضّہ آپ ہی آپ کہتی جا رہی تھی۔

کنول آپا نے ککّی کو گود میں اُٹھا اور وہ گاڑی کو سیڑھیوں پر دھکیلتی ہُوئی نیچے لے گئیں۔ فِضّہ دوڑتی ہُوئی جھُولے کے قریب پہنچ گئی۔ دُوسری سب لڑکیاں بھی وہیں کھڑی تھیں۔

جھُولے والی رنگ برنگی موٹروں میں بچّے اور عورتیں بیٹھی تھیں اور موٹریں گھوم رہی

تھیں۔ باجا بج رہا تھا۔ لڑکیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں اور تالیاں بجاتیں۔

جب جھولا تھما اور لوگ نیچے اُترے تو باجا بھی تھم گیا۔ موٹروں میں اور لڑکیاں لڑکے بیٹھنے لگے تو فضہ نے کنول آپا سے کہا:

"ہم بھی جھولے میں بیٹھیں گے آپا جان!"

"ہاں ہاں۔ بٹھا لیجیے بچیوں کو مس صاحبہ!" جھولے والے سفارش کی۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ ان لڑکیوں کی اُستانی ہی ہو سکتی ہے۔ ماں تو ہو نہیں سکتی۔

"کیا لیتے ہو؟" کنول آپا نے پوچھا۔

"دو آنے سواری۔"

کنول آپا نے اپنے بٹوے کو کھول کر پیسے گنے اور شرمندہ سی ہو کر اپنے آپ بڑبڑائیں "پیسے تو تھوڑے ہیں۔ ڈھائی روپے چاہئیں۔" جھولے والے نے سُن لیا۔

"یہ سکول کی لڑکیاں ہیں مس صاحبہ؟" جھولے والے نے پوچھا۔

"یہ یتیم خانے کی بچیاں ہیں۔" کنول آپا نے بتایا۔

"اوہو! پھر تو ساری قوم کی بچیاں ہیں۔ آؤ بچو، بیٹھو گاڑیوں میں۔ کرائے کی پروا نہ کرو۔"

لڑکیاں کنول آپا کی طرف دیکھنے لگیں جو پیسے نہ ہونے پر شرمندہ کھڑی تھیں۔

"اجازت دیجیے بچوں کو مس صاحبہ! بلکہ آپ خود بھی بچے کو لے کر بیٹھ جائیے۔ مُنّا خوش ہو جائے گا۔" جھولے والا کنول آپا سے کہہ رہا تھا۔

"بھیّا! ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ تمھارا اتنا نقصان ہو۔ تمھارے اور گاہک کھڑے ہیں۔ انھیں بٹھاؤ۔" کنول آپا نے کہا۔

"واہ! اور بچیاں منھ دیکھیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چار پانچ موٹریں ان سے رُک گئیں

تو کیا ہُوا باقی جو ہیں گاہکوں کے لیے ۔" وہ کہنے لگا ۔

آخر کنول آپا کی اِجازت سے لڑکیاں موٹروں میں بیٹھ گئیں ۔ کنول آپا کو بچّوں کے ساتھ جھُولا جھُولتے کچھ اچھّا نہ لگا ۔ وہ نہیں بیٹھیں ۔ جھُولے کو حرکت ہُوئی اور ساتھ ہی باجا بجنے لگا ۔ اس بار تو جھُولے والے نے اور بھی اچھّا باجا بجایا اور جھُولا بھی دیر تک چلتا رہا ۔ جب تھما تو بچّیاں نیچے اُتر کر جھُولے والے کے گرد جمع ہو گئیں جو ان کِھلے کِھلے چہروں کو دیکھ کر خود بھی مارے خوشی کے کِھلا جا رہا تھا ۔

"اب تو خوش ہو بچّیو!" وہ پُوچھنے لگا ۔

"جی ہاں شکریہ ! آپ بہُت اچھّے آدمی ہیں!" کئی لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا ۔

"آپ بہُت نیک آدمی ہیں ۔ آپ نے یتیم لڑکیوں کے لیے اِتنا نقصان برداشت کیا ہے۔"

کنول آپا نے کہا ۔

"ہم بے چاری یتیم لڑکیاں ہیں ۔ چوہوں والے، ٹوٹے پھُوٹے گھر میں رہتی ہیں ۔" ریحانہ نے بڑی مِسکین صُورت بنا کر کہا ۔

"کوئی بات نہیں ۔ اللہ رحم کرے گا ۔" جھُولے والے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ۔ "کبھی میں بھی غریب تھا ۔ مجھے غریب کے دِل کا درد اچھّی طرح معلُوم ہے ۔"

"اور یتیم بھی تھے آپ ؟" ریحانہ نے پُوچھا ۔

"یتیم ؟ یُوں کہو کہ یتیم سے بھی بد تر ۔ میرا سوتیلا باپ تھا جو مجھ پر ظُلم کرتا تھا ۔ صُبح سے شام تک مجھ سے کھیتوں میں کام کرواتا اور رات کو اِتنی روٹی بھی نہ دیتا کہ میرا پیٹ بھر سکے ۔ میں ہمیشہ بھُوکا رہتا اور پیٹ بھر کھانے کو ترستا رہتا ۔"

"اُف ! کتنی افسوس کی بات ہے کہ کوئی بچّوں سے ایسا سلُوک کرے ۔ ہم تو اِن بچّیوں پر

جان چھڑکتے ہیں اور انھیں اچھّے سے اچّھا کھانے کو دیتے ہیں۔" کنول آپا کہنے لگیں۔
"شکر ہے، شکر ہے۔" جھولے والا کہنے لگا۔
کنول آپا نے جھولے والے کا شکریہ ادا کیا اور بچّیوں سے کہنے لگیں "چلو، اب جلدی جلدی قدم اُٹھاؤ۔ دِن ڈھل رہا ہے۔"
سب لڑکیاں جلدی جلدی چلنے لگیں مگر فضّہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ اِسی لیے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہی تھی۔ کنول آپا نے سمجھا وہ تھک گئی ہے۔ اُنھوں نے گاڑی کا ہتّھا خود تھام لیا۔ فضّہ نے ان کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور بولی:
"آپ ہمیں بہت پیار کرتی ہیں کنول آپا؟"
"بہت" کنول آپا ہنس کر بولیں۔
"اگر آپ کو کوئی دس لاکھ روپیہ اور پیارا سا بنگلہ رہنے کو دے اور کہے کہ ان بچّیوں سے الگ ہو جائیں تو آپ وہ بنگلا اور

دس لاکھ روپیہ لے لیں گی؟"
فضّہ کی اس بات پر کنول آپا کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں۔ پھر بولیں:
"لاؤ، گُڈّی کی گاڑی مجھے دھکیلنے دو۔ نہیں تو میں بنگلا اور دس لاکھ روپیہ لے کر چلی جاؤں گی۔"
"نہ بابا! یہ لے لیجیے گاڑی۔ مگر جایئے گا نہیں۔" فضّہ نے جھٹ گاڑی کا ہینڈل چھوڑتے ہُوئے کہا۔ وہ کنول آپا سے الگ ہونے کے خیال سے یُوں سہم گئی جیسے وہ سچ مچ جا رہی ہوں۔

فضّہ دیوار میں گڑ گئی

اب تو گرمی خاصی پڑنے لگی تھی اور بارشیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ مریم باجی ہر وقت ڈرتی رہتیں کہ کہیں چھت نہ گر پڑے۔ بچّیوں کے کہیں اور رہنے کا اِنتظام نہ ہو سکا تھا۔ دِن

کو تو کنول آپا انھیں قریب کے ایک پارک
میں لے جایا کرتیں مگر بارش ہوتی تو رات
کو اُنھیں چھت کے نیچے ہی سونا پڑتا۔
رات خیریت سے گزر جاتی تو باجی شکر کرتیں۔
لڑکیاں پڑھائی سے فارغ ہوتیں تو پارک
میں آنکھ مچولی کھیلا کرتیں۔ کنول آپا بنچ پر
بیٹھ کر سلائی کا کام کرتی رہتیں۔ فضّہ لڑکیوں
کے ساتھ دوڑنے بھاگنے کے بجائے ککّی کو
گاڑی میں بٹھا کر لیے پھرتی۔
ایک دن فضّہ ککّی کی گاڑی کو دھکیلتی ہوئی
پارک کے اس حصّے کی طرف جا نکلی جہاں
رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ مگر ابھی وہ
پھولوں کے قریب پہنچنے نہ پائی تھی کہ راستے
میں اس نے چار پانچ لڑکوں کو دیکھا جو
ایک جیسے دھاری دار کپڑے پہنے ہوئے
تھے اور گولیاں کھیل رہے تھے۔ فضّہ نے
گاڑی ان کے قریب روک لی۔ اُس نے

لڑکوں کو گولیاں کھیلتے آج تک نہ دیکھا تھا۔
ایک لڑکا اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔
"کیا تم یتیم لڑکے ہو؟" فضّہ پوچھنے لگی۔
"سب ہی یتیم ہیں۔" وہ کہنے لگا۔ اتنے
میں لڑکے کے کسی ساتھی نے پکارا۔

"تمھاری باری اسلم!"
یہ سنتے ہی وہ لڑکا جھٹ گھٹنوں کے بل

زمین پر بیٹھ گیا۔ فضّہ اور بھی قریب چلی آئی۔
"میں بھی یتیم لڑکی ہُوں۔ ہم اس سامنے والے گھر میں رہتے ہیں جس کی چھت گِرنے والی ہے اور اس گھر میں بہت سی چُوہیّاں ہیں۔" وہ بتا رہی تھی۔
اسلم کے ساتھی نے جو سب سے بڑا تھا، اس کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔
"اُونھ! لڑکیوں کے گھر میں چُوہیّاں ہی تو ہوں گی۔ ہمارے ہاں چُوہے ہیں۔" وہ کہنے لگا۔
"ابھی تک تو وہ اُوپر کی چھت میں ہیں۔ مگر آج ہی کل میں چھت گِر جائے گی تو جہاں ہم وہیں چُوہے۔ کیوں کہ شیخ صاحب کہتے ہیں چھت گِرنے کو ہے۔" دُوسرے لڑکے نے کہا۔
"ہماری چھت بھی گِر جائے گی۔ وہ بھی گِرنے کو ہے۔" فِضّہ نے بتایا۔

"تو ہم کیا کریں؟ کل کی گِرتی آج گِر جائے۔ ہم تو جلد ہی ایک نئے مکان میں چلے جائیں گے۔" اسلم کہنے لگا۔
"واہ! خواب نہ دیکھو نئے مکان کے۔ ہمیں کون لے جاتا ہے وہاں۔ وہ مکان تو یتیم خانے کے ایک بہت بڑے افسر نے اپنے لیے لیا ہے۔ نام ہمارا کیا ہے۔" ایک لڑکا کہنے لگا جس کے مُنھ پر چیچک کے داغ تھے۔
"تُم ہمیشہ بے ایمانی کی سوچتے ہو۔ اس لیے کہ خود جو بے ایمان ہو۔ کھیل میں بھی دھاندلی کرتے ہو۔" لمبے لڑکے نے چیچک کے داغوں والے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا۔
"ٹھیک ہے۔ کِسی کے بارے میں بُری بات نہیں سوچنی چاہیے۔" اسلم کہنے لگا۔
"یہ تُم لوگ کیا کھیل رہے ہو؟ آہا! کیسی پیاری پیاری گولیاں ہیں! کیا تُم مجھے کھیلنے دو گے؟" فِضّہ نے کہا۔

وہ گاڑی کو دھکیل کر اور قریب لے آئی۔
لڑکے ہنس پڑے۔
"ارے! کیسی بے وقوف لڑکی ہے۔ اسے اتنا بھی پتا نہیں کہ یہ لڑکوں کا کھیل ہے۔" چیچک کے داغوں والا لڑکا ہنس کر بولا۔
"تو کیا ہُوا؟ لڑکیاں بھی کھیل سکتی ہیں"۔ فِضّہ کہنے لگی۔
مگر اس کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا اور کھیل میں لگ گئے۔
"ہائے ککّی! یہ لڑکے مجھے بھی کھیلنے دیں تو کتنا اچھا ہو۔" جب کسی نے نہ سُنا تو فِضّہ ککّی ہی سے کہنے لگی۔
چیچک کے داغوں والا لڑکا جیتی ہُوئی گولیاں جیب میں ڈالتے ہُوئے، فِضّہ کو گھُور کر دیکھنے لگا۔ فِضّہ نے اپنی بات پھر دُہرائی۔
"یہ لڑکے مجھے ایک بار کھیلنے دیں تو میں

دُوسری بار کھیلنے کو نہیں کہُوں گی۔"
"لڑکیاں گولیاں نہیں کھیلتیں۔" لمبے لڑکے نے ڈانٹ کر کہا۔
"اچھّا! کیا لڑکیاں گولیاں نہیں کھیلتیں؟" فِضّہ نے حیران ہو کر پُوچھا۔
"ذرا کھیلنے تو دو اسے۔ دیکھیں بھلا کرتی کیا ہے؟" چیچک کے داغوں والے لڑکے نے کہا۔
"مگر اس کے پاس گولیاں تو ہیں نہیں۔ کھیلے گی کیا؟" ایک اور لڑکے نے کہا۔ اس کے سامنے کے دانت نہیں تھے۔
"میں اسے اپنی گولیاں دے دُوں گا اور پھر واپس جیت لُوں گا۔" چیچک کے داغوں والا لڑکا کہنے لگا۔ پھر وہ فِضّہ کی طرف دیکھ کر بولا:
"تمھیں معلوم ہے نا، جب کوئی گولیاں ہار دے تو واپس نہیں لے سکتا؟ اور گولیاں نہ

نہ ہوں تو کھیلا بھی نہیں جا سکتا ؟"

فضّہ نے ہاں کہتے ہوئے گردن ہلائی۔ لڑکے نے کچھ گولیاں اُس کے ہاتھ میں دے دیں۔ فضّہ کا دل مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ جیسے اُس نے کوئی بہت ہی قیمتی چیز پا لی ہو۔

"اب ان میں سے چار کو اس دائرے کے گرد رکھو جہاں ہماری گولیاں رکھی ہیں۔ اور اس طرح مارو۔" ٹوٹے ہوئے دانتوں والے لڑکے نے اُسے ترکیب بتائی۔ فضّہ نے سر کے اشارے سے بتایا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔

"تمھاری گولی سے جتنی بھی گولیاں دائرے کے اندر جائیں گی، وہ تمھاری ہوں گی۔"

فضّہ نے سیدھ لی اور تاک کر نشانہ لگایا۔ دو گولیاں لڑھکتی ہوئی دائرے کے اندر جا پڑیں۔

"تم نے کبھی پہلے بھی گولیاں کھیلی ہیں ؟"

چیچک کے داغوں والے لڑکے نے پوچھا۔

فضّہ نے نہ کہتے ہوئے سر ہلایا اور غور سے دوسروں کو باری لیتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ پھر اس کی باری آ گئی۔ اب کے اس نے تین گولیاں دائرے میں گرائیں اور جیت کر اُٹھا لیں۔

"یہ جھوٹ بولتی ہے۔ پہلے بھی گولیاں کھیلتی رہی ہے۔" بڑے لڑکے نے جل کر کہا۔ کیوں کہ یہ تینوں گولیاں اس کی تھیں۔

"جب گگی بڑا ہو جائے گا تو تم اسے اپنے ساتھ گولیاں کھیلنے دو گے ؟" فضّہ پوچھنے لگی۔

"ارے ! کیا یہ لڑکا ہے ؟"

"ہاں ! جب اس کے دانت نکل آئیں گے تو پھر یہ تمھارے پاس بھیج دیا جائے گا۔" فضّہ نے بتایا۔

"ارے واہ ! کون ؟ یہ بچّہ ؟ ہم تو اسے

کبھی بھی نہیں رکھیں گے۔ ہمارے ہاں پہلے ہی کیا تھوڑے کیڑے مکوڑے اور چوہے ہیں۔ اب بچّے بھی وہاں رہنے چلے آئیں؟" لمبے لڑکے نے غصّے سے کہا۔

"مگر شیخ صاحب تو کہتے ہیں کہ وہ ککّی کو لڑکوں کے یتیم خانے میں لے جائیں گے۔" فضّہ نے بتایا۔

"نا بھائی! ہمیں چوہے منظور ہیں، بچّہ منظور نہیں۔ چیچک کے داغوں والے لڑکے نے کہا۔

"اور جو شیخ صاحب اسے لے ہی آئے تو تمہیں اسے کھلانا ہو گا افضل! ہم تو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔" ٹوٹے ہوئے دانتوں والا لڑکا کہنے لگا۔

"تم اپنے ککّی کو ہمارے ہاں نہ بھیجنا۔ نہیں تو اس کی بری گت بنے گی۔ ہاں۔" افضل نے فضّہ کو ڈرانا چاہا۔ "ہر روز تو ہمیں مار پڑتی ہے اور بھوکا الگ رہنا پڑتا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے لمبے لڑکے کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"یہ دیکھو، ماسٹر نے مار مار کر میرا کیا حال کیا ہے۔" لمبے لڑکے اپنے کُرتے کی آستین ہٹا کر بازو پر ایک نشان دکھایا۔ دُوسرا لڑکا پاجامہ ہٹا کر گھٹنے پر زخم دکھانے لگا۔

"یہ دیکھو، مولوی صاحب نے چھڑی مار کر میری چمڑی اُدھیڑ ڈالی۔"

فضّہ پریشان ہو گئی۔ بولی "مگر ککّی تو چھوٹا سا بچّہ ہے۔ اسے تو وہ نہیں ماریں گے۔"

"کیوں نہیں ماریں گے۔ اسے تو اور بھی زیادہ مار پڑا کرے گی، کیوں کہ یہ رویا کرے گا۔" ٹوٹے ہوئے دانتوں والا لڑکا کہنے لگا۔

"چلو چھوڑو اِس قصّے کو، پہلے گولیوں کی بات کرو۔ وہ ہماری گولیاں لیے جا رہی ہے۔ اسے کھیلنے کو کہو تاکہ ہم اپنی گولیاں

واپس جیت سکیں۔" ایک اور لڑکے نے انھیں یاد دِلایا۔

کھیل پھر سے شروع ہُوا۔ مگر جب فِضّہ کی باری آئی تو اُس نے دو گولیاں اور جیت لیں اور جانے کے لیے مُڑی۔

"کیا تُم سچ کہتی ہو کہ تُم نے اس سے پہلے کبھی گولیاں نہیں کھیلیں؟" لمبے لڑکے نے پُوچھا۔

فِضّہ نے بھولے پن سے سر ہلاتے ہُوئے نہ کہہ دیا۔ اِتنے میں کنول آپا نے اُسے آواز دی۔ "فِضّہ! فِضّہ!"

"کنول آپا مجھے پُکار رہی ہیں۔" فِضّہ نے گولیوں کو جیب میں ڈالتے ہُوئے کہا۔ مگر لڑکے اُس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

"تُم نہیں جا سکتیں۔ تمھارے پاس ہماری گولیاں ہیں۔ ہم وہ واپس جیتنا چاہتے ہیں۔" لمبے لڑکے نے کہا۔

"فِضّہ! فِضّہ!" کنول آپا پُکار رہی تھیں۔

مگر لمبا لڑکا فِضّہ کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "گولیاں جیتے بغیر ہم اسے نہیں جانے دیں گے۔ یہ جھُوٹ بولتی ہے اسے گولیاں کھیلنا آتا ہے۔"

اِتنے میں کنول آپا خُود ہی آ گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ریحانہ تھی۔ لڑکے ایک طرف ہٹ گئے اور فِضّہ جلدی سے گاڑی کو گھُما کر نِکل آئی۔ پھر اُس نے کنول آپا اور لڑکیوں کو سارا حال سنایا، گولیاں دکھائیں جنھیں دیکھ کر لڑکیاں بہُت خوش ہُوئیں۔

"کنول آپا! ہم گگّی کو وہاں کبھی نہیں جانے دیں گے۔ وہ لوگ لڑکوں کو مار مار کر اُن کی کھال اُدھیڑ دیتے ہیں۔" وہ آنکھیں پھاڑتے ہُوئے کہہ رہی تھی۔ مگر کسی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا۔

"نہیں ننھّی! لڑکے ویسے ہی تمھیں چھیڑتے

ہوں گے"، کنول آپا نے کہا۔

مگر فضّہ کو پورا یقین تھا کہ لڑکے سچ کہتے تھے اور جب کوئی بھی اس کی بات ماننے کو تیار نہ ہوا تو اس کو یوں محسوس ہوا جیسے دُنیا بھر میں اس کے سوا ککّی کا کوئی سچّا ہمدرد نہیں۔

اب تو فضّہ دِن رات اسی فکر میں رہنے لگی کہ وہ کیسے ککّی کو لڑکوں کے یتیم خانے میں جانے سے بچائے۔ اِتنا چھوٹا بچّہ وہاں ظالم ماسٹروں کی مار کیسے سہہ سکے گا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ ککّی کو لپٹا کر رو پڑتی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے ایک ترکیب نکالی۔ اس نے سوچا جھولے والے کے پاس جاؤں اور ککّی کی مدد کرنے کو کہوں۔ وہ بہت اچھّا آدمی ہے۔ وہ ضرور ککّی کو ان بھیڑیوں سے بچا لے گا۔ شاید

وہ اُسے اپنا مُنھ بولا بیٹا ہی بنا لے۔ اس یتیم خانے سے تو وہ جھولے والے کے پاس رہ جائے تو اچھّا ہو گا۔

دوپہر کو جب ککّی سو رہا تھا اور لڑکیاں اور مریم باجی کام میں لگی تھیں تو وہ چپکے سے باغ میں نکل گئی۔ دروازہ بند تھا۔ فضّہ کو یاد تھا کہ پچھواڑے کی دیوار میں ایک سُوراخ ہے۔ مگر وہ سُوراخ اِتنا بڑا نہ تھا کہ فضّہ اس میں سے باہر نکل جاتی۔ اس نے پتّھر کے ٹکڑے سے کُرید کُرید کر ایک اینٹ اور نکال لی۔ اب یہ سُوراخ اور بڑا ہو گیا۔ فضّہ کا خیال تھا کہ وہ اس میں سے باہر نکل سکے گی۔

پہلے اُس نے سر باہر نکالا۔ پھر کندھوں کو سُوراخ میں ڈال کر پیروں سے زور لگایا تو وہ سُوراخ میں پھنس گئی۔

گلی میں لوگ آ جا رہے تھے مگر کسی

نے فضّہ کی طرف خیال نہ کیا۔ اُسے جب باہر نکلنا مشکل معلوم ہُوا تو اپنے آپ کو واپس اندر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ ایک اینٹ اور نکال لے تو آسانی سے نکل سکے گی۔ مگر وہ تو وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ اب تو اس سے ہلا بھی نہیں جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دیوار تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گئی اور زور زور سے چلّانے لگی۔

اِتنے میں ایک عورت سر پر ٹوکرا اُٹھائے قریب سے گزری۔ اُس نے ایک بچّی کو دیوار میں پھنسا دیکھا تو رُک گئی۔

"تم یہاں دیوار میں پھنسی کیا کر رہی ہو، ننھّی؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"میں باہر نکلنا چاہتی تھی کہ پھنس گئی۔ دیوار مجھے چھوڑ نہیں رہی۔" فضّہ نے رو کر کہا۔

عورت نے ٹوکرا سر سے اُتار کر رکھ دیا

اور فضّہ کو باہر کی طرف کھینچنے لگی۔ جب باہر نہ کھینچ سکی تو اندر صحن میں دھکیلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر لڑکی تو سوراخ میں جم کر رہ گئی تھی۔ نہ آر ہوتی تھی نہ پار۔ عورت ڈر گئی اور دوڑتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔

اُس نے دروازہ کھلوایا اور باجی کو سارا حال بتایا۔ وہ باہر آئیں تو فضّہ کو دیوار میں پھنسے ہوئے پایا۔

اِتنے میں لڑکیاں بھی نکل کر صحن میں آ گئیں۔ "ہائے ہائے! دیوار فضّہ پر گر پڑی ہے۔" ریحانہ نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

کئی لڑکیاں دروازے سے نکل کر باہر چلی آئیں تاکہ دیکھیں فضّہ کا اگلا دھڑ کس حال میں ہے۔ راستہ چلتے لوگ بھی رُک گئے اور بھیڑ بڑھنے لگی۔ ہر شخص بچّی کو

باہر نِکالنے کے لیے اپنا اپنا مشورہ دے رہا تھا۔
ان میں ایک آدمی ذرا سمجھ دار تھا۔ وہ راج
کو ڈھونڈنے دوڑا۔ دُوسرے آدمی نے جلدی
سے قریب کی دُکان سے ایک بن لاکر فضّہ
کو دیا جسے وہ مزے لے لے کر کھانے لگی۔
تھوڑی دیر بعد راج آ گیا۔ لیکن جب اُس
نے ایک بچّی کو دِیوار میں پھنسا دیکھا تو
بہُت خفا ہُوا۔ بولا "توبہ! میں سمجھا کوئی
دِیوار بنانی ہے۔ خواہ مخواہ میرا وقت برباد کیا۔"
"تمھیں اپنی مزدُوری لینی ہے۔ اس سے
تمھیں کیا کہ دِیوار بنانی ہے یا گرانی ہے۔
جلدی سے کام شرُوع کرو۔" کنول آپا نے
غُصّے سے کہا۔ کیوں کہ فِضّہ نے پھر پُورے
زور سے چِلّانا شرُوع کر دیا تھا۔ بن کھانے
سے اب اس میں اِتنی طاقت آ گئی تھی کہ
چِلّا سکے۔
جب راج نے سُوراخ بڑا کر کے فِضّہ کو

باہر نکالا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ فضّہ کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تو کنول آپا نے اُسے لپٹا لیا اور بولیں:

"بڑی شریر ہو تم ننّھی! تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔"

فِضّہ کو سزا ملی

باجی فِضّہ کو اندر لے گئیں اور اس کے جسم کو غور سے دیکھا کہ کہیں کوئی ہڈّی پسلی نہ ٹوٹ گئی ہو مگر فضّہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ جب باجی کو تسلّی ہو گئی کہ بچّی کو کوئی نُقصان نہیں پہنچا تو اُنھوں نے اس سے پُوچھا:

"مگر تم دِیوار میں کیوں جا گھُسی تھیں؟"

فِضّہ کی طبیعت نِڈھال ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت باجی سے کچھ بھی چھُپا نہ سکی۔ اس نے بتا دیا کہ وہ گگّی کو خطرے میں پا کر

جھُولے والے سے مدد مانگنے جا رہی تھی، کیوں کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں مانتا کہ لڑکوں کے یتیم خانے والے بچّوں کو بُری طرح پیٹتے ہیں۔

"اور گگّی بے چارہ کیسے اُن کی مار کھائے گا؟ اسی لیے میں جھُولے والے سے کہنے جا رہی تھی کہ وہ گگّی کو اپنے پاس رکھ لے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اُس نے بہت تکلیفیں اُٹھائی تھیں۔ اِسی لیے وہ چھوٹے بچّوں پر رحم کرتا ہے۔"

باجی نے حیران ہو کر پوچھا "مگر یہ بات تمھیں سُوجھی کیسے؟"

"یہ سب کچھ میں نے آپ ہی آپ سوچا۔ کِسی نے بھی مجھے نہیں بتایا۔ نہ ریحانہ نے نہ محمودہ نے، نہ عائشہ نے۔ کِسی نے بھی نہیں۔"

باجی خفا ہو کر بولیں "ٹھیک ہے۔ اور کون تمھیں ایسی بُری بات کرنے کو کہہ سکتا

تھا۔ یہ تمھارا ضدّی پن ہے جو تمھیں ایسی حرکتوں پر اُکساتا ہے۔ یہ تمھارے جتنی چھوٹی سی بچّی کے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ میں کنول اور شیخ صاحب کس لیے ہیں؟ میں تمھیں اس غلطی کی ضرور سزا دوں گی۔"

انھوں نے آج تک فضّہ کو نہیں ڈانٹا تھا۔ اس لیے فضّہ انھیں غصّے میں دیکھ کر سہم گئی۔ اور سب بچّیاں بھی سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

"تم جانتی ہو کنول! میں ان بچّیوں کو کتنا چاہتی ہوں۔ اگر میری اپنی اولاد ہوتی تو میں اسے اس سے زیادہ پیار نہ دے سکتی۔ مگر غلطی کے لیے سزا ضرور دوں گی۔" باجی کنول آپا کو پریشان دیکھ کر کہنے لگیں۔

پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولیں "تم ہی بتاؤ، اسے کیا سزا دی جائے؟"

"میرا خیال ہے، کل صبح ایک بڑے سے

کاغذ پر یہ لکھ کر فضّہ کے فراک کے آگے اور پیچھے لگا دیا جائے کہ میں ضد چھوڑ دوں گی۔" کنول آپا نے رائے دی۔

"ہاں، یہ اچھّی ترکیب ہے۔ مگر ضد عادت نہیں فطرت ہے اور فطرت کو انسان بدل سکتا ہے نہ چھوڑ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے لکھا یہ جائے کہ میں کبھی اجازت کے بغیر باہر نہیں نکلوں گی۔ کیوں؟ کیا خیال ہے تمھارا؟" باجی نے کہا۔

"جی ہاں! یہ بہتر ہے۔ یہی فقرہ موٹے لفظوں میں لکھ کر فضّہ کے فراک کے آگے اور پیچھے چپکا دیا جائے۔" کنول آپا نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرو۔"

اگلی صبح کنول آپا نے کاغذ کے دو بڑے بڑے ٹکڑے لیے اور موٹے موٹے حرفوں میں اُن پر لکھ کر، ایک فضّہ کے آگے اور دوسرا پیچھے چپکا دیا۔

"تم شام تک اسی طرح پھرو گی۔ سُن لیا؟" اُنھوں نے فِضّہ سے کہا۔ فِضّہ نے سر ہلا دیا۔

شام کو شیخ صاحب آئے تو انھیں ساری بات بتائی گئی۔ "افسوس کی بات ہے! بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔" وہ سر ہلا کر آپ ہی آپ بڑبڑائے۔

"جی، اس بار تو اِسے معاف کر دیجیے۔

وہ اپنی حرکت پر شرمندہ ہے۔" باجی نے کہا۔

"میں بچّی کے بارے میں نہیں کہہ رہا۔ میں تو اُن یتیم خانے کے ممبروں کے بارے میں کہہ رہا ہُوں۔ اچھّی بھلی حویلی مِل رہی تھی۔ ذرا سی کوشش کرتے تو مِل جاتی۔ مگر رُوپے کا اِنتظام نہ کر سکے۔ اب پھر یہی تجویز ہُوا ہے کہ ان ہی پُرانی عمارتوں کی مرمّت کر دی جائے۔"

"آپ بھی تو یہی چاہتے تھے کہ مرمّت ہو جائے۔" باجی نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر راج مزدُور تو کہیں مِلتے نہیں۔ سرکاری عمارتیں اور سڑکیں بن رہی ہیں۔ سب وہاں لگے ہُوئے ہیں۔ مرمّت ہوگی تو کیسے؟ اگر وہ حویلی لے لیتے تو میں کوشش کر کے ایک حِصّہ لڑکیوں کے لیے روک لیتا۔ تھوڑا سا روپیہ خرچ کر کے بچّے محفُوظ ہو جاتے۔ مگر میں تو ان ممبروں کے

ہاتھوں مجبُور ہُوں۔ عجیب ٹیڑھی عقل کے آدمی ہیں۔"

شیخ صاحب باجی سے زیادہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ کُچھ سوچنے لگے۔ باجی چُپ رہیں اور وہ سوچتے رہے۔

"اچھّا! میں اب لڑکوں کے یتیم خانے کی طرف جا رہا ہُوں۔ آج کے اس واقعے سے ضرُوری ہو گیا ہے کہ اِس لڑکے کو ... کیا نام ہے اِس لڑکے کا؟ گگّی۔ ہاں تو گگّی کو لڑکوں کے یتیم خانے میں پہنچا دیا جائے۔" شیخ صاحب نے کہا۔ باجی گگّی کے یُوں اِیکا ایکی جانے کے خیال سے گھبرا گئیں اور بولیں:

"مگر شیخ صاحب! وہ تو ... ..." شیخ صاحب نے ان کی پُوری بات نہ سُنی۔ وہ بیچ میں بول اُٹھے:

"کوئی بات نہیں۔ یعقوب اس کی پُوری دیکھ بھال کرے گا۔ اُس نے تین چار بچّے پالے ہیں اور وہ اب خاصے بڑے ہو گئے ہیں۔ آپ فِکر نہ کریں۔ بچّے کو تیّار کر دیں میں آج شام یا پھر کل صُبح آ کر اسے لے جاؤں گا۔"

شیخ صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔ اس بار باجی اُن کے ساتھ جھگڑ نہ سکیں۔

"سارا قصُور اس فِضّہ کا ہے۔ نہ یہ دیوار میں پھنستی، نہ شیخ صاحب گگّی کو لڑکوں کے یتیم خانے میں لے جانے کو کہتے۔" باجی کو فِضّہ پر کبھی غصّہ نہ آیا تھا۔ مگر آج وہ اس پر بہُت خفا تھیں۔

"دیکھ لیا تُم نے اپنی شرارت کا نتیجہ؟ اب بے چارے گگّی کو ہم سے جُدا کر دیا جائے گا۔" باجی نے فِضّہ سے کہا جو مُنہ لٹکائے پاس ہی کھڑی تھی۔

فِضّہ جھولے والے کو ڈھونڈنے نکلی

پھر اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر باجی نے کنول آپا سے کہا:

"شیخ صاحب تو اب تیسرے پہر ہی ککّی کو لینے آئیں گے۔ میں ذرا لڑکوں کے یتیم خانے جا کر یعقوب سے مِلتی ہُوں اور دیکھتی ہُوں کہ چھوٹے بچّوں کو رکھنے کا اُن کے ہاں کیا اِنتظام ہے۔"

یہ کہہ کر باجی تو چلی گئیں مگر ککّی کے لیے روتے روتے کنول آپا کے سر میں درد ہو گیا۔ جب ککّی جھولے میں سو گیا تو کنول آپا بھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ سب لڑکیاں بھی اندر چلی گئیں کیوں کہ باہر کافی گرمی ہو گئی تھی۔ مگر فِضّہ سب کے کہنے پر بھی نہ گئی اور برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھی رہی۔

اس کی ضِد پر عائشہ نے خفا ہو کر کہا "چلو، بیٹھی رہنے دو اسے۔ آپ ہی آ جائے گی۔" اور سب اُسے اکیلا چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔

فِضّہ وہاں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی۔ "آج تو میرے فراک پر وہ کاغذ نہیں چپکا ہُوا کہ میں باہر نہ نکل سکوں۔ اگر وہ کاغذ لگا ہوتا تو مجھے کنول آپا سے اِجازت لینی پڑتی مگر اب تو میں چُپکے سے ککّی کو لے کر نِکل جاؤں گی اور تھوڑی ہی دیر میں جھولے والے کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ وہ ضرور ککّی کی مدد کرے گا، اور پھر دیوار کا سُوراخ بھی تو بڑا ہو گیا ہے۔ میں آسانی سے ککّی کو لے کر نِکل سکتی ہُوں۔"

وہ آہستہ سے اُٹھی اور سوتے ہُوئے ککّی کو اُٹھا کر باہر لے آئی۔ برآمدے میں ککّی کی گاڑی کھڑی تھی۔ اُس نے ککّی کو گاڑی میں لِٹا دیا

وہ ذرا سا کسمسایا مگر گاڑی کے چلتے ہی پھر سو گیا۔

فضّہ گاڑی دھکیلتی ہوئی دیوار کے سوراخ میں سے باہر نکل گئی۔ وہ تیزی سے اس طرف چلی جدھر اُس دن کنول آپا انھیں سیر کرانے لے گئی تھیں۔

وہ دھوپ سے بچتی بچاتی آخر باغ میں داخل ہو گئی۔ پہلے ہی تختے کے ایک بڑے لان میں اُسے کچھ لوگ دکھائی دیے۔ وہ پکنک کے لیے آئے تھے اور میز کرسیاں تک لائے تھے۔ میز پر سفید کپڑا بچھا تھا اِرد گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ درمیان میں پھولوں کا بڑا سا خوب صورت گل دستہ سجا ہوا تھا اور اس کے گرد چائے کا سامان لگایا گیا تھا۔

فضّہ نے حیران ہو کر دیکھا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ پکنک کیا ہوتی ہے مگر وہ اس انتظام کو دیکھ کر خوش ضرور ہوئی اور ککّی

سے کہنے لگی:

"جب ہمارا گھر گر جائے گا تو ہم بھی یہیں آ کر کھانا کھایا کریں گے۔ مگر تم تو ہمارے ساتھ نہیں ہو گے ککّی! تم تو جھولے والے کے پاس ہو گے۔ وہ تمھیں کبھی نہیں مارے گا، پیار سے اپنے ساتھ رکھے گا اور جھولا جھلایا کرے گا۔"

وہ بچّے سے باتیں کرتی گاڑی کو دھکیل رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ تختے کے آخری سرے پر سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جھولے والا سامنے ہی ہو گا اور وہ اسے آواز دے کر بُلا لے گی۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر سامنے پڑی تو وہاں جھولے کا نشان تک نہ تھا۔ پاس ہی دو تین مالی کام کر رہے تھے۔ وہ اُن سے پوچھنے لگی:

"وہاں سے جھولا کہاں گیا بھیّا؟"

"جھولے والا لے گیا اور کہاں جاتا۔" ایک نے ہنس کر جواب دیا۔

"اور جھولے والا کہاں گیا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"وہ کہیں اور چلا گیا۔ یہ لوگ کہیں ایک جگہ تو نہیں رہتے۔ جہاں کہیں میلا وہلا ہو وہیں جا کر جھولا لگا لیتے ہیں۔" دوسرے آدمی نے اُسے سمجھایا۔

"کہاں ہے میلا؟" فضّہ نے پوچھا۔

"یہاں سے تھوڑی دُور مادھو لال حُسین کا مزار ہے۔ وہاں بڑا بھاری میلا لگا ہے۔"

"کس طرف ہے وہ؟" فضّہ پوچھنے لگی۔

"اسی سڑک پر، آگے جا کر۔" مالی نے اشارے سے بتایا۔

پہلے تو فضّہ کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رونے لگے مگر اس نے آنسوؤں اور اپنے گلے میں پھنسی ہُوئی چیخوں کو بڑی کوشش سے روکا اور گاڑی واپس پھیری۔

"کوئی بات نہیں گگّی! کوئی بات نہیں ہیں تمھاری خاطر جھولے والے کو ڈھونڈ نکالوں گی۔" وہ سر ہلا ہلا کر بچّے سے کہنے لگی جو کچھ نہ سمجھتے ہُوئے بھی ہنس دیا اور وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلی تو ایک آدمی سے پوچھا "میلا کہاں لگا ہے؟"

آدمی نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ وہ اُسی طرف چل پڑی۔ اب دھوپ خاصی ڈھل گئی تھی۔ سائے لمبے ہو گئے تھے۔ فضّہ گگّی کی گاڑی کو سائے میں چلاتی ہُوئی اسی طرف بڑھتی گئی جس طرف اس آدمی نے اشارہ کیا تھا۔

چلتے چلتے ایک ایسی جگہ آئی جہاں راستے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اب تو فضّہ ڈرنے لگی۔ اسے جنوں بھوتوں اور دیو پریوں کی وہ سب کہانیاں یاد آ گئیں جو اُس نے

سُن رکھی تھیں ۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ ڈر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔ مگر لڑکی نہیں ۔ آخر اسے ایک کار راستے میں کھڑی ہُوئی مِلی ، جو خراب ہو گئی تھی ۔ دو آدمی پاس کھڑے تھے اور ایک نیچے گھُسا ہُوا اسے ٹھیک کر رہا تھا ۔ انھیں دیکھ کر فِضّہ کا دم میں دم آیا ۔ وہ ان کے قریب جا کر ٹھہر گئی اور کہنے لگی :

"آپ نے اس آدمی کو کار کے نیچے دے دیا ہے ؟"

یہ سُن کر وہ آدمی ہنس پڑے ۔ ایک بولا "نہیں مُنّی ! وہ کار ٹھیک کر رہا ہے ۔ تم ڈرو نہیں ۔ ہم نے اسے کار کے نیچے نہیں دیا ۔"

"مگر اِتنی دُھوپ میں اس چھوٹے سے بچّے کو کہاں لیے پھرتی ہو بیٹی ؟ کہاں جانا ہے تمھیں ؟" دُوسرے نے پُوچھا ۔

"یہ میرا بھیّا ہے ۔ میں اسے لے کر جھُولے والے کے پاس جا رہی ہُوں ۔ شیخ صاحب اسے لڑکوں کے یتیم خانے میں لے گئے تو وہاں ماسٹر یعقُوب اسے پیٹا کرے گا ۔ اسی لیے میں اسے نِکال لائی تاکہ جھُولے والا اسے اپنے پاس رکھ لے ۔ وہ بہُت اچھّا ہے ۔ وہ اسے نہیں مارے گا ۔" فِضّہ کہتی چلی گئی مگر اس کی بے جوڑ باتوں کا مطلب وہ آدمی نہ سمجھ سکے ۔

"پھر بھی ، تُم اپنے ساتھ کِسی بڑے کو تو لائی ہوتیں ۔" پہلے آدمی نے کہا ۔

فِضّہ سر ہلا کر بولی "کوئی بھی میری بات نہیں مانتا ۔ باجی اور آپا دونوں ہی کہتی ہیں کہ ماسٹر یعقوب اتنے چھوٹے بچّے کو نہیں مار سکتا ۔ مگر لڑکے کہتے ہیں ضرُور مارے گا ۔" فِضّہ اِتنا کہہ کر گاڑی کو دھکیلتی ہُوئی آگے بڑھ گئی ۔

اِتنے میں اِسے پیچھے سے چند مرد اور عورتیں آتی دِکھائی دیں۔ یہ لوگ بھی میلے میں جا رہے تھے۔ دو بڑی بڑی بسیں مُسافروں سے بھری ہُوئی آئیں اور گزر گئیں۔ اب فضّہ کو اس سڑک پر چلتے ہُوئے ڈر نہ لگا۔ کیوں کہ اب بڑی رونق ہو گئی تھی۔ وہ بڑوں کی طرح بڑے رُعب سے گردن اٹھائے گاڑی کو دھکیلتی ہُوئی چلی جا رہی تھی۔

"ہائے اللہ! کتنا پیارا بچّہ ہے یہ!" ایک عورت نے ککّی کو دیکھ کر کہا۔

"بچّے ہوتے تو پیارے ہیں مگر مُصیبت بھی ہوتے ہیں۔" فضّہ نے اپنے ماتھے سے ٹپکتا ہُوا پسینہ پونچھ کر بڑوں کی طرح کہا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اِس پر عورت ہنس پڑی اور اسے پیار کرتی ہُوئی آگے بڑھ گئی۔

وہ کچھ دُور گئی تھی کہ ایک کار آئی جس پر لاؤڈ سپیکر لگا تھا اور کار میں بیٹھا ہُوا آدمی لوگوں کو بتا رہا تھا کہ وہ اپنے کپڑے صرف فرینڈز لانڈری سے دُھلوائیں۔ ورنہ وہ صاف نہ ہوں گے۔

ایک لڑکا لوگوں میں رُومال بانٹ رہا تھا۔ کاغذ کے بنے ہُوئے یہ رنگ برنگے رُومال فضّہ کو بہت پیارے لگے۔ اس نے بھی لینے کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ لڑکے نے نیلے رنگ کا ایک رُومال اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر فضّہ نے اِسے کھول کر دیکھا تو اس پر کچھ لکھا دیکھ کر ڈر گئی۔ اس نے سوچا کہیں اس پر یہ نہ لکھا ہو کہ "میں اِجازت کے بغیر باہر نہ نکلوں گی۔"

اس نے ایک عورت کو ٹھہرا کر اس سے پوچھا کہ رُومال پر کیا لکھا ہے؟

عورت نے پڑھ کر سُنایا "لکھا ہے کہ

اے بی سی کے بسکٹ سب سے اچھّے ہوتے ہیں۔" فِضّہ کی تسلّی ہو گئی اور اس نے رومال اپنے پاس رکھ لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب میلے میں پہنچ گئے۔ فِضّہ جُھولے والے کو اِدھر اُدھر دیکھتی آئے بڑھ رہی تھی کہ پیچھے سے کِسی سائیکل سوار نے چیخ کر کہا:

"ہٹ جاؤ سامنے سے! دیکھو تو سہی اس بے وقُوف لڑکی کو۔" یہ کہہ کر وہ زنّاٹے سے گزُر گیا۔

فِضّہ نے حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ دونوں طرف قطار باندھے کھڑے تھے۔ سب ہی چلاّ رہے تھے اور جو چلاّ نہیں رہے تھے وہ پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھ رہے تھے۔ سائیکلوں کی دیوار آگے بڑھی آ رہی تھی۔ وہ ڈر سی گئی اور گھبرا کر سائیکلوں کے آگے آگے دوڑنے لگی۔ وہ پوُرے

زور سے گاڑی کو دھکیل رہی تھی کہ اس کا پاؤں ایک پتّھر پر پڑا۔ گاڑی کا ہینڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گاڑی کچھ دُور تک آپ ہی آپ لڑھکتی چلی گئی

اور فِضّہ لڑھک کر دُوسری طرف جا گری۔

اس کی کُہنیاں اور گھٹنے چھِل گئے۔ ایک آدمی نے لپک کر ککّی کی گاڑی کو ایک طرف ہٹا دیا۔ نہیں تو وہ سائیکلوں کے ریلے میں آ کر پلٹ گئی ہوتی۔

فِضّہ کو اُٹھنے کا موقع ہی نہ مِلا اور سائیکلیں اُمنڈتے ہُوئے دریا کی طرح اس کے سر پر آ گئیں۔ وہ وہیں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی مگر سائیکلوں کا دریا ایک دم دو حِصّوں میں پھٹ گیا اور سائیکلیں فِضّہ کے دونوں طرف سے گزر گئیں۔

اب وہ اُٹھی اور گرد سے اٹے ہُوئے کپڑوں کو جھاڑتی گاڑی کی طرف چلی۔ گاڑی کے گرد لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر وہ ڈر گئی کہ ککّی کو خبر نہیں کیا ہُوا ہے۔

"ہائے میرے مُنّے! مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں یہ مُصیبت آئے گی۔ اچھّا تھا ہم گھر ہی میں رہتے۔"

اِتنے میں ایک کار میں سے دو آدمی باہر نِکلے "یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ایک آدمی نے لوگوں سے پُوچھا۔

مگر کِسی نے کُچھ جواب نہ دیا۔ صرف ان آدمیوں کو گزرنے کا راستہ دے دیا تاکہ وہ جا کر خود ہی دیکھ لیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

"کیا ان بچّوں کو سائیکل والوں نے گرایا ہے؟" ایک آدمی نے پُوچھا۔

"نہیں۔" فِضّہ نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہُوا؟" دُوسرے نے پُوچھا۔

فِضّہ نے ککّی کو گود میں لے لیا۔ دونوں آدمی حیران ہو کر ان بچّوں کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ تم یہاں کیا کرتی پھر رہی ہو ننھّی؟" اس آدمی نے پُوچھا۔

"جی وہ ہیں نا شیخ صاحب، ککّی کو لڑکوں کے یتیم خانے میں لے جانا چاہتے ہیں مگر میں اسے وہاں نہیں بھیجنا چاہتی۔ وہاں ماسٹر یعقوب

اس کو پیٹا کرے گا۔ اِسی لیے میں اِسے لے آئی ہُوں۔ میں اسے جھُولے والے کو دینا چاہتی ہُوں۔ وہ اسے پال لے گا اور مارے گا بھی نہیں۔ مگر اب تو میں اِتنی تھک گئی ہُوں کہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔"

بھیڑ کو ہٹا کر دونوں آدمی اس کے اور قریب آ گئے۔ اُن کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا کہ قِصّہ کیا ہے۔

"تم رہتی کہاں ہو؟"

"جی، ہم لوگ ایک ٹُوٹے پھُوٹے گھر میں رہتے ہیں۔ گھر کیا ہے کھنڈر ہے اور اس میں اِتنی چوہیّاں ہیں کہ رات کو ہمارے اُوپر پھُدکتی پھرتی ہیں۔ اس گھر کی دیواریں اور چھتیں گِرنے کو ہیں۔ بس کِسی نہ کِسی دِن کوئی چھت گِر پڑے گی اور ہم بیسوں کی بیسوں یتیم بچیّاں اس کے نیچے دب کر مر جائیں گی۔ مریم باجی بھی یہی کہتی ہیں اور

کنول آپا بھی۔"

اب لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ یہ یتیم خانے کی لڑکی ہے۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک کے کندھے پر کیمرا لٹک رہا تھا۔ وہ دُوسرے سے بولا:

"چلو چھوڑو رفیق! سائیکل دوڑ کا آخری حِصّہ ہم سے چھُوٹ جائے گا۔ مجھے ابھی تصویریں بھی لینی ہیں۔ چلو چلیں۔"

مگر رفیق نے سر ہلاتے ہُوئے نہ کر دی۔ وہ بولا: "سائیکلوں کی دوڑ سے زیادہ یہ بات ضرُوری ہے۔ تم نے سُنا نہیں، یہ بچّی کیا کہہ رہی ہے؟ اِتنی ننھّی سی جان اس بچّے کو بچانے کے لیے اُس خطرناک گھر سے نِکل آئی ہے اور لڑکوں کے یتیم خانے میں اُسے اِس لیے نہیں جانے دیتی کہ وہاں ظالِم ماسٹر ان لاوارث بچّوں کو مارتے ہیں۔ اُف! اُف! کیا وہ اِنسان ہیں؟ سوچو تو سہی۔ حد

بچّی کی تصویر اُتارو۔"

اس نے بچّے کو گاڑی میں بٹھا کر ہینڈل فضّہ کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود اپنی نوٹ بک کھول کر کچھ لکھنے لگا۔ ساتھ ہی فضّہ سے سوال کرتا جاتا جس کا وہ اپنی عقل کے مطابق جواب دیتی جاتی۔ دوسری تصویر بچّے کو اس کی گود میں دے کر اُتاری گئی۔

"رفیق! خدا کے لیے اب تو یہاں سے چلو۔ مجھے سائیکل دوڑ کی تصویریں لینی ہیں۔" فوٹو گرافر بولا مگر رفیق نے اس وقت تک اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیا جب تک کہ فضّہ اور ککّی کو واپس بھیجنے کا اِنتظام نہ ہو گیا۔

ایک آدمی نے بچّوں کو واپس پہنچانے کا ذمّہ لیا "میں اس بچّی کو پہچانتا ہوں۔ میرا مکان یتیم خانے کے قریب ہی ہے۔ میں انھیں پہنچائے دیتا ہوں۔ آپ لوگ بے فکر

ہو کر اپنا کام کریں۔"

رفیق نے گاڑی کو ایک تانگے میں رکھ دیا، فضّہ کی گود میں ککّی کو تھما دیا اور بولا: "اسے اچھّی طرح پکڑے رہنا۔"

"آپ ان بچّوں کا حال اور تصویریں اخبار میں چھاپیں گے صاحب؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"جی ہاں! ہم اِن یتیم بچّوں کی آواز قوم کے اُن لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ جو توفیق رکھتے ہوئے بھی ان بے ماں باپ کے بچّوں کی مدد نہیں کرتے۔"

"کون سے اخبار میں ان کا حال اور تصویریں چھپیں گی تاکہ ہم وہ اخبار خرید کر پڑھیں؟" دُوسرے آدمی نے پوچھا۔

"نوروز میں۔ میں نو روز کا رپورٹر ہوں اور یہ فوٹو گرافر ہیں۔" رفیق نے جواب دیا اور دونوں کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔

جب تانگے والا بچّوں کو لے کر آیا تو

یتیم خانے کے سب لوگ گیٹ پر جمع تھے۔
"تم کہاں گئی تھیں فضّہ؟" باجی نے غصّے سے پوچھا۔
"جھولے والے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم میلے میں گئے اور وہاں سائیکل دوڑ میں پھنس گئے۔ میں گر گئی اور ککّی کی گاڑی لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔" فضّہ خوش ہو کر اپنی سیر کا حال سنا رہی تھی۔
"شریر لڑکی! میں تو تیرے ہاتھوں اس قدر تنگ آ گئی ہوں کہ نہیں جانتی تیرے ساتھ کیا سلوک کروں۔" باجی روہانسی آواز میں کہہ رہی تھیں۔
"میں بتاؤں؟ آپ مجھ پر پھر وہی کاغذ لکھ کر لگا دیں۔"
"چپ رہ شریر! ایک تو قصور کرتی ہے اور اوپر سے باتیں بگھارتی ہے۔" فضّہ سہم کر چپ ہو گئی۔

"سب سنو! کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہ بولے۔ میں اور کنول آپا بھی اس سے بات نہیں کریں گے۔ ایک ہفتے تک اس سے کوئی نہ بولے گا۔ بس ایسی لڑکی کی یہی سزا ہے۔"
باجی نے اس بار فضّہ کو بڑی سخت سزا دی تھی۔ فضّہ کے تو ہوش اڑ گئے۔ وہ سہم کر ایک ایک کا منہ تکنے لگی۔ باجی اندر چلی گئیں۔
"ہمارے ساتھ کوئی نہیں بولتا ککّی! ہمیں کوئی پیار نہیں کرتا۔ یہاں کسی کو بھی ہماری ضرورت نہیں۔ بھئی آج کا دن تم اور رہ جاؤ تو ہم کل پھر جھولے والے کو ڈھونڈنے نکلیں گے۔ میں اس سے کہوں گی کہ تمہارے ساتھ مجھے بھی اپنے پاس رکھ لے۔" وہ ککّی سے باتیں کرتی اور روتی ہوئی اندر جانے کے لیے اٹھی۔

ریحانہ جان بُوجھ کر پیچھے رہ گئی تھی۔ جب سب وہاں سے چلے گئے تو وہ فِضّہ کے کان میں کہنے لگی:

"اُداس نہ ہو ننّھی! زیادہ دِنوں تک تُم سے کون رُوٹھ سکتا ہے۔ بہُت جلد سب تُم سے بولنے لگیں گے۔ مگر اب باہر نہ نِکلنا۔"

جِیت فِضّہ کی ہُوئی

اگلے دِن سب بچّے آپ ہی آپ فِضّہ سے بولنے لگے۔ کِسی کو سزا کا خیال تک نہ رہا۔

ہُوا یہ کہ جب روز کی طرح کنول آپا بازار سے سودا سُلف لے کر آئیں تو اُن کا رنگ اُڑا ہُوا تھا، ہونٹ خُشک تھے اور وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی تھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ دیکھیے۔۔۔" وہ اخبار کو لہراتے ہُوئے بس اِتنا ہی کہہ پائیں۔

"کیا ہے کنول؟ خیر تو ہے؟ کچھ کہو تو

سہی؟" باجی گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"توبہ ہے! آپ پڑھیے تو سہی۔" کنول آپا کُرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ارے! کیا ہُوا؟ کیا لڑائی شرُوع ہو گئی ہے؟" باجی مارے خوف کے آنکھیں پھاڑ کر پُوچھنے لگیں۔

"نہیں۔ لڑائی سے بھی بد تر۔ اِس فِضّہ نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا۔ بدنامی ہو گی۔ ممبر ہم پر ناراض ہوں گے اور شاید ہماری نوکری بھی جاتی رہے۔" کنول آپا نے روہانسی آواز میں کہا۔

"دِکھاؤ تو۔۔۔ ایسا بھی کیا غضب ڈھایا ہے فِضّہ نے؟" باجی کو کنول آپا کے یُوں بدحواس ہونے پر غُصّہ آ گیا۔

اُنھوں نے اخبار ان کے ہاتھ سے لے کر پھیلایا تو سب لڑکیاں دائیں بائیں جمع ہو کر ان کے کندھوں پر سے اخبار کو جھانکنے لگیں۔

"ہائے اللہ! یہ فِضّہ اور ککّی کی تصویریں ہیں!

اِتنی بڑی بڑی اور پہلے صفحے پر!" باجی حیران ہو کر چیخ اٹھیں۔

فِضّہ جلدی جلدی لڑکیوں کی بھیڑ چیرتی ہوئی باجی کی گود میں آ گھسی۔ اس نے دیکھا کہ سچ مچ

وہ اس کی اور ککّی کی تصویر تھی۔ وہ تصویر میں اپنا اور ککّی کا مُسکراتا ہُوا چہرہ دیکھ کر مُسکرا دی۔

"ہاں! یہ تصویر اس آدمی نے اُتاری تھی۔ شاید وہ دوڑ میں نے اور ککّی نے ہی جیتی ہو گی۔

وہ کچھ دوڑ ہی کی باتیں کر رہا تھا۔" فِضّہ خوش ہو کر بولی۔

اِتنے میں باجی نے تصویر کے نیچے لکھی ہُوئی یہ سطریں پڑھیں:

"کیا ان دو دوستوں کو جُدا کرنا دُرست ہے؟"

تصویر کے نیچے ایک لمبی چوڑی خبر تھی۔ باجی نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا:

"ہماری قوم کا ضمیر کیا بالکل مر چُکا ہے کہ یہ معصوم رُوحیں دوزخ کا عذاب بھُگت رہی ہیں؟ ان کے سر پر چھتیں گرنے کو ہیں۔ دیوار ان کو کُچلنے کے لیے جُھکی پڑتی ہے۔ چوہوں کی کثرت سے کِسی وقت بھی وبا پھُوٹ پڑنے کا خوف ہے۔ کیا قوم کے یتیموں کا اسی طرح خیال رکھا جاتا ہے؟

یہ معصوم بچّی اس بچّے کو چھپاتی پھر رہی ہے کہ کہیں اسے لڑکوں کے یتیم خانے میں جا کر ظالم ماسٹروں کی مار پیٹ نہ سہنی پڑے۔"

اتنا پڑھ کر باجی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اخبار ان کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ سسک کر بولیں:

"لو! ہماری بد انتظامی کا اشتہار ساری دنیا نے پڑھ لیا۔ ہم نے ان بچّوں کی پرورش میں اپنی جان گھلا دی اور اس کا صلہ ہمیں یہ ملا....."

لڑکیاں زہریلی نظروں سے فضّہ کو گھور رہی تھیں اور کنول آپا الگ سر تھامے بیٹھی تھیں۔

"شہر میں آج ہر شخص کی زبان پر یہی قصّہ ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ یتیم خانے والوں کے پاس جا کر پوچھیں گے کہ قوم انھیں جو روپیہ دیتی ہے وہ کہاں جاتا ہے؟ وہ حکومت سے کہیں گے کہ وہ اس معاملے کی چھان بین کرے۔"

کنول آپا نے کہا۔

"بس ہماری نوکری ختم سمجھو۔" باجی نے ہاتھ

مل کر کہا۔

"جی، اب تو ہمیں اپنا سامان باندھنا چاہیے۔ ابھی حکم آیا کہ آیا۔" کنول آپا کہنے لگیں۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ "وہ ..... شاید شیخ صاحب آ گئے۔" عائشہ کہنے لگی۔ گھنٹی پھر بجی۔

"نہیں۔ یہ جھولے والا ہو گا۔ اخبار میں پڑھ کر مجھے اور ککّی کو لینے آیا ہو گا۔" فضّہ بولی۔

کنول آپا مارے ڈر کے پوری آنکھیں پھاڑے کھڑی تھیں۔ وہ بولیں،

"نا بابا! میں تو دروازہ نہیں کھولوں گی۔ میں تو اپنا سامان باندھنے جا رہی ہوں۔"

مگر باجی دلیری سے اٹھیں اور بولیں "ٹھہرو! میں جاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کون آیا ہے اور کیا کہتا ہے۔ کوئی ہمیں پھانسی تو چڑھا نہیں دیں گے۔ نوکری سے ہی جواب دے دیں گے نا؟"

مگر دروازے تک جاتے جاتے ان کی ہمّت جواب دے گئی۔ "کوئی میری جان لے لے مگر

ان بیس بچیّوں اور اکیسویں بچّے کو مجھ سے نہ چھینے۔" وہ روہانسی آواز میں بولیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ریحانہ خبر نہیں کس وقت دوڑی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی اور اس نے کنڈی کھول دی۔ شیخ صاحب ہر بڑائے ہوئے اندر آئے۔ اِن کے ہاتھ میں بھی اخبار کا پرچہ تھا جسے وہ باجی کی طرف لہراتے ہوئے بولے:

"دیکھا نا، سچ آخر سچ ہے۔ دیکھ لو اسے اخباروں تک نے مان لیا۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

باجی نے آنسو بھری آنکھوں سے شیخ صاحب کو دیکھا اور بولیں "کیا یہ "نو روز" ہے۔ آپ نے پڑھا ہے؟" وہ پوچھنے لگیں۔

"ہاں ہاں۔ ایک بار نہیں کئی بار پڑھا ہے۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔" شیخ صاحب بڑے جوش سے بولے۔

"منٹ منٹ کے بعد میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور ممبر مجھ سے تفصیل پوچھ رہے تھے۔ پہلے تو انھیں بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ یہ اچانک ہمارے یتیم خانوں کے متعلق اخبار میں کیسے چھپ گیا!"

"آپ نے پہلا صفحہ دیکھا ہے؟" باجی نے پوچھا۔

وہ سوچ رہی تھیں کہ شیخ صاحب شاید کسی اور خبر کا ذکر کر رہے ہیں۔

"جی ہاں صاحب پڑھا ہے۔ میں نے ہی نہیں شہر بھر میں ہر آدمی نے پڑھا ہے۔ اب سمجھو ہمارا کام بن گیا۔ اخبار ایک بہت بڑی قوت ہے۔ اور اس وقت اُس نے، ایک ضدّی اور ہٹ کی پکّی ننھّی سی بچّی کی حمایت کرکے ہمارا ساتھ دیا ہے۔" وہ کہتے جا رہے تھے مگر باجی کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں۔ اُنھوں نے پوچھا "مگر اس وقت آپ کے تشریف لانے کی وجہ کیا ہے؟" مگر شیخ صاحب نے جواب

دینے کے بجائے خود اُن سے سوال کر دیا:
"باجی! کیسا رہے اگر آپ کو بیس بچّیوں کے علاوہ اکّیس لڑکوں کی بھی ماں بنا دیا جائے؟"
"آپ کو مذاق سُوجھا ہے۔ شیخ صاحب! میری جان ہوا ہُوئی جاتی ہے۔ جب سے اخبار پڑھا ہے ہوش اُڑ گئے ہیں۔ اب خبر نہیں کیا ہونے کو ہے؟" وہ کانپتی ہُوئی آواز میں بولیں۔
"ہو گا کیا؟ بس نمبروں کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہیں۔ اخبار میں ہماری ننھّی فِضّہ کی خبر پڑھ کر انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب وہ نیا مکان لینے کو تیّار ہیں۔" شیخ صاحب نے بتایا۔
"اچھّا!" باجی نے حیران ہو کر کہا۔
"اور میری جس تجویز کو وہ اِتنے دِن سے ٹھکرا رہے تھے، آخر ہماری ننھی فِضّہ نے ان سے منوا لیا۔" شیخ صاحب جوش سے بولے۔
"وہ کیا تجویز تھی آپ کی؟" باجی نے پُوچھا

"بھئی میں ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ مکان خرید لیں اور لڑکوں لڑکیوں کے یتیم خانے کو اکٹھّا کر دیں۔ اب وہ میری بات مان گئے ہیں۔"

لڑکیاں خوش ہو کر تالیاں بجانے لگیں۔ شیخ صاحب نے فِضّہ کو گود میں اُٹھا لیا۔

"بس! اب تو خوش ہو نا ننھّی؟ اب تم سب ایک شان دار مکان میں رہا کرو گی۔" وہ کہنے لگے۔

"اور ککّی بھی ہمارے ساتھ رہے گا؟" فضّہ نے پُوچھا۔

"ہاں! ایک کیا اب بیس ککّی تمھارے ساتھ رہیں گے۔ وہ تو تمھارے بھائی ہیں۔" شیخ صاحب نے کہا۔

"واہ وا! اب تو ہم بیس بہنیں اور اکیّس بھائی ہیں۔" ریحانہ ناچ کر بولی۔

شیخ صاحب سب کو پیار کر کے خوشی خوشی رُخصت ہُوئے۔ باجی نے انھیں آج تک اِتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

اگر آپ کو یہ کہانی پسند آئی ہے تو انہی بہنوں کی تیسری کہانی:

"بیس بہنوں نے بِلّی پالی"

ضرُور پڑھیے۔ بہُت دِل چسپ اور مزے دار کہانی ہے۔

بکواس کہانی

ناول ۔۔۔ پاکیزہ کے پڑھنے کے لیے

کشمیر کی بیٹی

رازیوسفی

بہادر اور جاں باز کشمیری لڑکی کی کہانی جو اپنے وطن کو آزاد کرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوئی اور میدان جنگ میں ایسے جوہر دکھائے کہ مرد بھی عش عش کر اٹھے۔

کیا وہ خواب تھا؟

فرحانہ حفیظ

ارشد بلا گئی تھا۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کرتا تھا۔ ان اس نے سچ بولا لیکن لوگوں نے اسے بھی جھوٹ ہی سمجھا دلچسپ اور حیرت انگیز باتیں کہ آپ پڑھتے وقت چل پڑیں گے۔

[illegible]

شوکت ہاشمی

ہمت نوجوان کی کہانی جس نے آباد دنیا سے دور ایک جزیرے کا سفر کیا اور سمندری ڈاکوؤں سے لڑ کے خزانے کو برآمد کر لیا۔

شاہین حملہ جنگ پر

آغا اشرف

ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا تو پوری قوم اس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑے تو بڑے بچوں نے [illegible] کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے۔

[illegible] کی سرگزشت

محمد یونس حسرت

[illegible] اور دین دار لڑکی کی کہانی جس نے بے پناہ [illegible] میں مگر نیکی اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

[illegible] کا دوگر

[illegible]

[illegible] دوگر نے ایک ایسی دوا بنائی جسے کھا کر انسان ہوا میں [illegible] تھا۔ وہ دوا اس کی لڑائی نے کون سی چھڑ کیا ہوا؟ یہ [illegible] پڑھیے۔ بہت مزیدار ناول ہے۔

پناکو کے کارنامے

سعید لخت

اٹلی کے مشہور مصور کارلو کولودی کا دلچسپ اور سبق آموز ناول سعید لخت نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھا۔

[illegible] جاسوس

آغا اشرف

ایک دلچسپ ناول جس سے بچوں میں ہمت، جرأت اور [illegible] کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

ایک بچہ ایک چور

ابو نثیا اقبال

نہایت دلچسپ اور جاسوسی کے کارناموں سے بھرپور ناول۔

[illegible] کا بادشاہ

عظیم الرحمان عثمانی

[illegible] کی مشہور کہانی۔ آسان اور دلچسپ زبان میں۔

[illegible] کی وادی

رحیم

چار بہن بھائی بھولے سے لٹیروں کی جیپ میں بیٹھ کر ایک ایسی وادی میں چلے گئے جہاں خزانہ گڑا تھا۔ ایک دلچسپ ناول

[illegible] بگلا

سلطانہ

[illegible] گلے میں [illegible] بہن بھائی رہتے تھے اور چاروں کو پالنے کی [illegible] شوق تھا۔ ایک دلچسپ ناول۔

[illegible]

رحیم

رات کے وقت گاؤں میں ایک اڑن طشتری اتری۔ اس میں سے ہر [illegible] کا ایک آدمی سوار تھا۔ نہایت دلچسپ اور معلوماتی ناول۔

[illegible]

محمد یونس حسرت

ایک دلچسپ اور معلوماتی کہانی جس میں گھاٹ کے بارہ [illegible] کو جاندار کرداروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور —— راولپنڈی —— پشاور —— حیدرآباد —— کراچی